فیض العینین

لحلّ

مشکلات المؤطّین

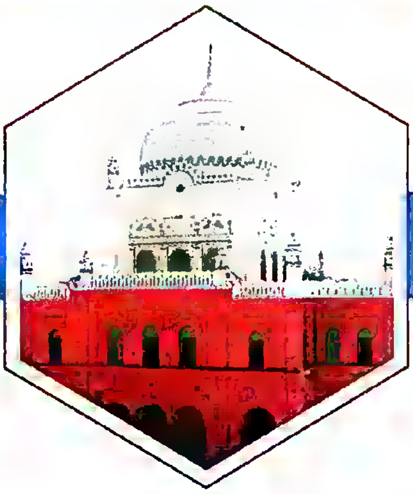

مُرتّب

محمد عبد اللہ القاسمی عفی عنہ

باہتمام

قاری فیض الحسن اعظمی

مکتبہ صوت القرآن دیوبند

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تفصیلات

نام کتاب : فیض العینین لحل مشکلات المؤطین
مؤلف : محمد عبداللہ القاسمی عفی عنہ
باہتمام : قاری فیض الحسن اعظمی غفرلہ
صفحات : 128
ناشر : مکتبہ صوت القرآن دیوبند 01336-223460

ملنے کے پتے

کتب خانہ حمیدیہ، جامع مسجد دہلی	❖	شبلی کتاب گھر اعظم گڈھ
ثاقب بک ڈپو سنبھل	❖	دیوبند اسلامک بک اسٹور دیوبند

مکتبہ صوت القرآن دیوبند
MAKTABA SAUTUL QURAN
Madani Market, Deoband, E-mail: faizulhasanazmi@gmail.com
Mob: 93586911053 Ph: 01336-223460
website: www.deobandtody.com/sautul-quran

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

انتساب

❁ ان اساتذہ کے نام کہ جن کی زیر تربیت رہ کر استفادہ کا موقع ملا بطورِ خاص اساتذۂ دارالعلوم دیوبند کے نام کہ جن کی قیمتی نصیحتوں نے میرے دل میں کامیابی اور علمی آراستگی کا محبوب تصور پیدا کیا۔

❁ والدین کے نام کہ جن کی دعائیں زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رہیں۔

محمد عبداللہ القاسمی عفی عنہ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

تقریظ

ادیبِ دوراں حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی دامت برکاتہم

استاذ حدیث ونائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

حامداً ومصلیاً ومسلما وبعد!

عزیز مکرم عبداللہ سلمہٗ نے درسِ نظامی کی اہم کتاب مؤطین کی کچھ مشکل عبارتوں کو حل کر کے ان کے مختصر نوٹس اردو زبان میں تیار کئے ہیں اور گنجلک عبارتوں کو مختصر انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عزیز مکرم عبداللہ سلمہٗ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے ہیں۔ یہ نشیط اور محنتی ہیں۔

عدیم الفرصتی کے باعث بندہ پوری کتاب تو نہیں دیکھ سکا تاہم بعض مقامات پر نظر ڈالی تو کتاب پسند آئی یوں تو مؤطین جیسی اہم کتاب پوری ہی حل کرنی چاہئے۔ الغرض یہ مجموعہ پسند آیا امید ہے کہ طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مؤلف سلمہٗ کی یہ پہلی کاوش ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور مزید علمی خدمات کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین۔

عبدالخالق سنبھلی

خادم دارالعلوم دیوبند

۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

حدیث کی لغوی واصطلاحی تعریف:

حدیث کے معنیٰ علّامہ جوہریؒ کے مطابق کلام کے ہیں، محدثین نے حدیث کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ”اقوال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وأفعاله وأحواله“ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور آپ کے احوال (اختیاریہ ہو یا غیر اختیاریہ) کو حدیث کہتے ہیں۔

علّامہ سخاویؒ نے فتح المغیث میں یہ تعریف کی ہے: ”ماأضيف إلى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قولًا أوفعلًا أوصفةً حتى الحركات والسكنات في اليقظة والمنام“ (فتح المغیث: ۱۲)

بعض حضرات نے مندرجہ ذیل الفاظ میں حدیث کی تعریف کی ہے، حالانکہ یہ حدیث کی تعریف نہیں؛ بلکہ علمِ حدیث کی تعریف ہے جبکہ حدیث اور علمِ حدیث کے درمیان فرق ہے:

”هو علم يعرف به اقوال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وأفعاله وتقريراته“

”وہ علم جس کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور آپ کی تقریر معلوم ہو“

تقریر سے مراد یہ ہے کہ کسی امتی نے آپ کے سامنے کوئی کام کیا یا کوئی بات کہی اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، نہ اس وقت نہ بعد میں، صفت سے مراد آپ کے احوالِ اختیاریہ اور غیر اختیاریہ (جیسے آپ کے حلیے، قد، چہرہ وغیرہ سے متعلق روایات) ہیں۔

قولِ صحابیؓ کو حدیث کہہ سکتے ہیں؟

متقدمین محدثین اور احناف کے نزدیک حدیث عام ہے اور اس کا اطلاق صحابہؓ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اور تابعین کے اقوال وافعال پر بھی ہوتا ہے، سیّد شریف جرجانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں اسی طرح صحابیؓ اور تابعیؒ کے قول وفعل اور تقریر کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ (ظفر الامانی:۴)

تاہم متأخرین، صحابہ وتابعین کے اقوال وغیرہ پر حدیث کا اطلاق نہیں کرتے، صاحبِ نور الانوار فرماتے ہیں:

"الحديث يطلق على قول النبي خاصةً"

یہی وجہ ہے کہ متاخرین اُصولیین بھی حدیث کی تعریف میں قولِ صحابی وتابعی کو ذکر نہیں کرتے؛ اس لیے انسب یہی ہے کہ حدیث کا اطلاق قولِ صحابی وتابعی پر نہ ہو، اور یوں بھی عرف میں حدیث کا لفظ سنتے ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال وغیرہ کی طرف ہی ذہن منتقل ہوتا ہے۔

موضوع: "ذات النبي صلى الله عليه وسلم من حيث أنه رسول لا من حيث أنه بشر وجسم"

غرض: (۱) "هو الفوز بسعادة الدارين بعد العمل على مرضياته والكف عن غير مرضياته"۔

تاہم یہ تمام علومِ شرعیہ کی قدرِ مشترک غرض ہے۔

(۲) دوسری غرض، فہمِ قرآن اور عمل بالقرآن ہے۔

(۳) معرفة كيفية اقتداء بالنبي صلى الله عليه وسلم۔

غایت: "هي معرفة الأحكام الشرعية ودلائلها وتفسير القرآن والعصمة عن الخطاء في نقل الروايات"۔

یعنی احکامِ شرعیہ کا جاننا (خواہ من قبیل احکام فرعیہ ہوں جن کو فقہ کہا جاتا ہے یا عقائد کے درجہ میں ہوں یا اخلاق کے درجہ میں ہوں) ان کے دلائل اور مرادِ قرآن کا

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جاننا اور نقلِ روایات میں غلطی سے محفوظ رہنا یہ اس علم کی غایت ہے۔

وجہ تسمیہ: حدیث حدوث سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ نئی چیز پیدا ہونے کے ہیں۔

اب حدیث کو حدیث اس لیے کہتے ہیں کہ قرآن مجید قدیم ہے اور اس کے مقابلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقاریر جو کہ حادث ہیں، اس لیے قدیم کے مقابلہ میں اس کو حدیث کہا گیا ہے۔

یا یوں کہہ لیجیے کہ حق تعالیٰ نے سورۃ الضحیٰ میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر تین احسان جتلا کر تین فرائض عائد فرمائے ہیں، احساناتِ ثلاثہ یہ ہیں:

(۱) اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○

کیا اس نے (اللہ تعالیٰ نے) آپ کو یتیم نہیں پایا پھر ٹھکانہ دیا۔

(۲) وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ○

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے خبر پایا سو راستہ بتلا دیا۔

(۳) وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ○

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار بنا دیا۔

ان تینوں احسانات کو جتلانے کے بعد تین فرائض لف ونشر غیر مرتب کے طور پر عائد فرمائے ہیں، وہ فرائض ثلاثہ یہ ہیں:

(۱) وَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○

آپ یتیم پر سختی نہ کیجیے۔ (یہ اَلَمْ يَجِدْكَ کے بالمقابل ہے)

(۲) وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○

اور سائل کو مت جھڑکیے۔ (یہ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا کے بالمقابل ہے)

(۳) وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اور اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کیجیے۔ (یہ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا کے بالمقابل ہے)

یہاں نعمت سے مراد ہدایت ہے، مطلب یہ ہوا کہ ہم نے آپ کو جو ہدایت عطا فرمائی ہے، اس کو دوسروں تک پہنچایئے۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل کے ذریعہ اس قرآنی حکم کی تعمیل کی؛ اس لیے آپ کے اقوال وافعال وتقاریر کو حدیث کہا جانے لگا۔

علّامہ تقی عثمانی زید مجدہٗ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کے لیے لفظ حدیث کو مخصوص کر لینا استعارۃ العام للخاص کے قبیل سے ہے۔

(درسِ ترمذی: ۱/۱۹)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

ابتداء ببسم اللہ

مصنف رحمہ اللہ نے اپنی مؤطا کو صرف بسملہ پر اکتفاء کرتے ہوئے شروع فرمایا حمدلہ کو ذکر نہیں کیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا اتباع کرتے ہوئے، مصنف رحمہ اللہ نے ایسا کیا ہے، قال تعالیٰ: اقرأ باسم ربّک معلوم ہوا کہ بسم اللہ سے ابتداء ہونی چاہیے اسی طرح حدیث میں ہے: كل امر ذی بال لم يبدأ فيه بسم الله فهو ابتر۔ اور ایسا ہی دیگر مصنفین صحاح ستہ میں سے سب ہی نے کیا ہے علاوہ امام مسلمؒ کے۔

۲۔ حدیث تحمید: كل امر ذی بال لم يبدأ بحمد الله فهو اقطع۔ میں کتابت کی قید نہیں ہے، بلکہ صرف ابتداء بالحمد مذکور ہے، ہوسکتا ہے مصنف نے بسملہ کی کتابت کے بعد حمد کو زبان سے ادا کیا ہو جیسا کہ امام احمدؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ روایت حدیث کے وقت صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے کہتے تھے لکھتے نہ تھے۔

۳۔ کسر نفسی کے طور پر حمدلہ کو ذکر نہ کیا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ یہ حکم تو مہتم بالشان کے لیے ہے اور میری یہ کتاب مہتم بالشان ہی نہیں کہ بسملہ کے بعد حمدلہ کو درج کیا جائے۔

ويمكن الاعتذار عنه بأن هٰذا التاليف لم يكن عند المصنف في امر ذی بال كما هو مشهور عند مشائخ الدرس في امثال هٰذا المحل۔

(اوجز المسالک: ج ۱/۱)

۴۔ یہ روایت جس میں حمد سے ابتداء کرنا مذکور ہے سنداً ضعیف ہے، اس کی سند میں محدثین نے کلام کیا ہے، ایسی ضعیف حدیث پر عمل کرنے اور نہ کرنے میں اختیار ہے۔

۵۔ ابتداء بالحمدلہ مخصوص ہے خطاب (بیان وتقریر) کے ساتھ، کتاب، خطوط اس میں داخل نہیں، دلیل اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل ہے وہ یہ کہ آپ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

صلی اللہ علیہ وسلم اپنا خطبہ ہمیشہ حمد سے شروع فرماتے، الحمد للہ نحمدہٗ الخ اور خطبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم نہ پڑھتے تھے، اس کے بالمقابل خطوط کی ابتداء صرف بسملہ سے فرماتے تھے، مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط من محمد رسول اللہ الیٰ ھرقل الخ اور صلح نامہ حدیبیہ میں ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ھٰذا ماقاضی علیہ محمد رسول اللہ وغیرہ وغیرہ۔

۶۔ حمد سے مقصود نفس ذکر ہے نہ کہ مخصوص لفظِ حمد، جیسا کہ مسند احمد کی روایت میں تصریح ہے:

کل امر ذی بال لم یبدأ بذکر اللہ فھو اقطع و ابتر۔

اور نفسِ ذکر بسملہ سے حاصل ہو گیا۔

۷۔ حمد کہتے ہیں صفاتِ کمالیہ کے اظہار کو اور یہ معنیٰ یقیناً الرحمٰن الرّحیم میں حاصل ہو گئے یہ جواب حضرت شیخ زکریا کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب (نوراللہ مرقدہما) کو پسند تھا۔ (الدر المنضود:۱/۷۸)

(محل امتحان نمبر:۱) باب وقوت الصّلوٰۃ

الوقوت وقت کی جمع کثرت ہے جیسے بدر کی جمع بدور، اور نماز و اوقاتِ نماز پانچ ہیں جو جمع قلت ہے۔

سوال: یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحبِ کتاب نے جمع قلت کے لیے جمع کثرت کا صیغہ کیوں استعمال کیا ہے تو اس کے چار جوابات دیے جاتے ہیں۔

جواب (۱): نماز کے اوقات کل تین طرح کے ہوتے ہیں وقتِ استحباب، وقتِ جواز اور وقتِ قضاء تو ان تین کو پانچ میں ضرب دینے سے پندرہ ہو جاتا ہے جو جمع کثرت ہے۔

جواب (۲): اصل نماز پچاس ہیں جو شبِ معراج میں مقرر ہوئی ہیں۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جواب (۳): ہر نماز میں دس نمازوں کا ثواب ملتا ہے، تو پانچ نمازوں میں پچاس نمازوں کا ثواب ملتا ہے، اس اعتبار سے جمع کثرت کا صیغہ لائے ہیں۔

جواب (۴): پوری زندگی میں ہر روز اوقاتِ نماز لوٹ لوٹ کر آیا کرتے ہیں، تو زندگی بھر میں اوقاتِ نماز اَن گنت ہو جاتے ہیں تو اس اعتبار سے جمع کثرت کا صیغہ لائے ہیں۔ (اوجز: ۱/۱، بحوالہ ایضاح الطحاوی: ۱/۴۰۷)

یہ جواب مؤطا امام مالک کے اکثر نسخہ کے اعتبار سے جس میں وقوت جمع کثرت کے ساتھ واقع ہے بعض نسخہ میں اوقات الصلوٰۃ جمع قلت کے ساتھ آیا ہے ایسا ہی ابن بکیر کے نسخہ میں ہے تب کوئی اشکال ہی نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ نماز پانچ ہیں تو اوقات بھی پانچ ہیں اور پانچ جمع قلت ہے نہ کہ کثرت۔

جمع قلت: وہ جمع ہے جس کو تین سے نو تک چیزوں کو بتانے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔

جمع کثرت: وہ جمع ہے جس کو تین یا تین سے زائد چیزوں پر بلا تعیین بولا جائے۔

الصلوٰۃ: صلوٰۃ کے لغوی معنیٰ دعاء کے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں صلوٰۃ دعاء کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ وصل علیھم ای ادع لھم۔ اور حدیث میں ہے: وإن کان صائمًا فلیصل۔ یعنی اگر کوئی شخص روزہ دار ہو (اور کوئی اس کی دعوت کرے) تو اس کو چاہیے کہ داعی کے مکان پر جا کر دعاء دے کر چلا آئے، اس کے بعد اس عبادت مشہور (نماز) کا نام رکھا گیا اس مناسبت سے کہ پوری کی پوری نماز دعاء پر مشتمل ہوتی ہے، اور کہا گیا ہے کہ لفظِ صلوٰۃ مشترک ہے دعاء، تعظیم، برکت اور رحمت کے درمیان یعنی صلوٰۃ کے یہ سب معنیٰ آئے ہیں اسی مناسبت سے صلوٰۃِ جنازہ کہا جاتا ہے باوجودیکہ اس میں نماز کی طرح رکوع وسجدہ نہیں ہے۔ (لانها بمعنى الرحمة ولذا سميت بها صلوٰة الجنازة: مع أنه ليس فيها ركوع ولا سجود

(اوجز المسالک: ۱/۱، الدر المنضود: ۱/۲)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

صلوۃ کی شرعی تعریف:

ھی ارکانٌ معھودۃٌ وافعال مخصوصۃ من القیام والقرأۃ وغیرھما فی اوقاتٍ معینۃٍ۔ (تحفۃ المرأۃ:۲۶۴)

وقوت الصلوۃ کی وجہ تقدیم: اس باب کو جملہ ابواب پر مقدم کیا ہے؛ اس لیے کہ نماز ام العبادات ہے؛ لیکن ابتداءً اوقات الصلوٰۃ سے بحث کریں گے؛ اس لیے کہ نماز کا اوقات ہی نماز کا سببِ وجوب ہے، ظہر کی نماز کا وقت ظہر کی نماز کے وجوب کا سبب ہے اور عصر کی نماز کا وقت صلوٰۃِ عصر کے وجوب کا سبب ہے وکذا، جس شخص پر جس نماز کا وقت ہی نہ آئے وہ نماز اس پر واجب نہیں جیسا کہ کہا گیا ہے کہ بعض ملکوں میں وقتِ عشاء پایا ہی نہیں جاتا وہاں غروب اور طلوع کے درمیان اتنا فصل ہی نہیں ہوتا کہ عشاء کا وقت آئے؛ اس لیے وہاں والوں پر عشاء کی نماز فرض ہی نہ ہوگی، مسبّب (نماز) کے لیے سبب (وقت) کا تحقق ضروری ہے، غرضیکہ نمازوں کے اوقات ان کے لیے اسباب ہیں، اسی وجہ سے مصنفؒ نے اوّلاً نمازوں کے اوقات کو بیان فرمایا ہے۔

کیا تمام وقت سببِ وجوب ہیں: اکثر مالکیہ حضرات نے تمام وقت کو اور شافعیہ حضرات نے اوّلِ وقت کو سببِ وجوب قرار دیا ہے، یہ اُصولِ فقہ کے مسائل ہیں فالیراجع إلیہ۔ (اوجز المسالک:۱/۱)

کیا اوقاتِ صلوٰۃ قرآن سے ثابت ہے؟ جی ہاں: پنج وقتہ نماز کے اوقات قرآنِ کریم کی کئی آیتوں سے اجمالاً ثابت ہے، جیسا کہ مفسر قرآن علّامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بیان کیا ہے:

اقم الصلوۃ طرفی النھار الغداۃ والعشی ای الصّبح والظھر والعصر وزلفًا جمع زلفۃ ای طائفۃ من اللیل ای المغرب والعشاء۔

(جلالین شریف:۱۸۹/۱، سورۂ ھود، پارہ:۱۲، رکوع۱۰)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس ای من وقت زوالھا الی غسق اللّیل اقبال ظلمۃ ای الظھر والعصر والمغرب والعشاء وقرآن الفجر صلوٰۃ الصبح۔ (جلالین:۱/۲۲۷، پارہ:۱۵)

فرضیتِ صلوٰۃ اور ترتیبِ صلوٰۃ کی حکمت:

تمام علماء کا اتفاق ہے کہ فرضیتِ صلوٰۃ شبِ معراج میں ہوئی ہے اور اس سے قبل کوئی نماز فرض نہیں تھی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃِ خمسہ سے قبل تہجد کی نماز فرض تھی اور تہجد کی فرضیت اللہ پاک کے ارشاد: "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ" سے منسوخ ہوگئی اور فجر وعصر کی دو دو رکعتیں فرض کی گئیں؛ پھر واقعۂ معراج کے بعد پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہوگئیں؛ کیونکہ یہ آیت شبِ معراج کے واقعہ سے قبل کی ہے، مگر یہ استدلال مضبوط نہیں ہے؛ کیونکہ اگر چہ یہ آیت واقعۂ معراج سے پہلے کی ہے مگر اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ دونوں نمازیں آپ پر فرض تھیں۔

ترتیبِ صلوٰۃ میں زوالِ عمر یعنی عمر ڈھلنے اور شکریہ ادا کرنے پر تنبیہ ہے مثلاً: فجر کی نماز میں تنبیہ ہے کہ اخ الموت یعنی نیند کے بعد تمہیں نئی زندگی ملی ہے اس لیے دو رکعت شکرانے کی ادا کرو اور ظہر کی نماز میں اشارہ ہے کہ اللہ نے تمہیں زندگی بخشی ہے اور اب دن کا زوال ہو رہا ہے اسی طرح تمہاری عمر کا بھی زوال ہونے والا ہے تمہاری عمر میں بقاء واستمرار نہیں ہے اب شباب اُترنے لگا ہے، اس لیے حق تبارک وتعالیٰ کو یاد کرو اور چار رکعتیں ادا کرو۔ اور تمہاری عمر اب ختم ہونے کو ہے تم موت کے قریب پہنچ چکے ہو اس کی طرف تنبیہ کرتے ہوئے چار رکعتیں عصر کی نماز فرض کی اور مغرب کی نماز سے اشارہ ہے استحضارِ موت کی طرف، جس طرح سورج نکل کر زوال ہوا اور اب غروب ہو رہا ہے اسی طرح تمہاری زندگی کا بھی سورج غروب ہو رہا ہے اور سورج غروب ہونے کے بعد شفق عشاء تک باقی رہتی ہے، اسی طرح تمہاری زندگی کا سورج غروب ہوگا اور اب تمہارا

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

تذکرہ چند دنوں تک ہے اس لیے عشاء کی نماز فرض کر کے اس کی طرف تنبیہ کی ہے۔
(کما فی المصالح العقلیۃ للأحکام النقلیۃ)

عن ابن شهاب ان عمر بن عبدالعزیز أخر الصلوة یوما الخ.
حدیث پاک کا ماحصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عصر کی نماز میں ذرا تاخیر کر دی تو ان کے پاس حضرت عروۃ بن الزبیر تشریف لائے اور حضرت مغیرہ بن شعبہ اور ابو مسعود انصاری کا واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے بھی نماز میں تاخیر کی تھی جس پر ابو مسعود انصاری نے امامتِ جبرئیل کا واقعہ بیان کیا جب یہ سارا واقعہ حضرت عروۃ بن الزبیر نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے سنایا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ عروہ غور کر لو کیا کہہ رہے ہو؟ عروہؒ نے کہا کہ بشیر بن ابی مسعود اپنے والد سے ایسی ہی روایت بیان کرتے ہیں اور انہوں نے حضرت عائشہؓ کی روایت بیان فرمائی: ''ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یصلی العصر والشمس في حجرتها قبل أن تظهر'' کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جبکہ سایہ دیوار پر نہیں چڑھتا تھا بلکہ دھوپ ان کے حجرے میں رہتی تھیں۔

أخر الصلوة: أی صلوة العصر؛ فإنه روی من طریق أبي داؤد عن الزهري ان عمر بن عبدالعزیز کان قاعداً علی المنبر فأخر العصر شیئًا یعنی ابوداؤد کی روایت میں عصر کے تاخیر کی صراحت ہے نیز بخاری میں بھی عصر کی صراحت موجود ہے اور عصر کی نماز ہونے پر حضرت عائشہؓ کی روایت بھی دلالت کر رہی ہے جسے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو حضرت عروہ نے سنائی ہے: ''ان رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی العصر'' الخ.

تاخیر کا سبب:

انه کان مشغولاً بمصالح المسلمین۔ یعنی مصالح مسلمین کی مشغولیت کی

وجہ سے عصر کی نماز میں تاخیر ہوگئی آپ کی یہ عادت مستمرہ نہیں تھی اس کی طرف لفظ یوماً سے اشارہ ملتا ہے۔

فقال عمر بن عبد العزیز: إعلم ماتحدث به یا عروة.

اعلم بصیغۂ امر ہے یا بصیغۂ متکلم، دونوں کا احتمال ہے مگر زیادہ مناسب بصیغۂ امر ہے؛ کیونکہ امام شافعیؒ کی ایک روایت میں ہے: "اتق یا عروة". (کما في هامش مؤطا مالک)

اعلم ماتحدث به یا عروة: جب حضرت عمر بن عبد العزیز سے عصر کی نماز میں مصالح المسلمین کی وجہ سے ذرا تاخیر ہوئی تو حضرت عروہ نے تنبیہاً امامتِ جبرئیل کا واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت جبرئیل نے حضور پاک ﷺ کو اوقاتِ صلوٰۃ بتلادیے ہیں پھر تاخیر کا کیا مطلب؟ اس پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا: اعلم ماتحدث الخ یعنی بلا سند کے حدیث کیوں بیان کرتے ہو، سند کے ساتھ حدیث بیان کرو، تاکہ شائبۂ کذب ختم ہوجائے پھر حضرت عروہ نے بشیر بن ابی مسعود تابعی کے واسطہ سے سنداً حدیث بیان کی۔

اعلم ماتحدث به یا عروة: کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کو شبہ ہوا کہ اوقاتِ صلوٰۃ میں جبرئیل کا واسطہ کہاں سے آگیا؟ جبکہ حق تبارک وتعالیٰ نے معراج میں بلا واسطہ اس کا علم عنایت فرمادیا ہے۔

علّامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

"والوجه عندي: أن الإستبعاد علی تعلیمه فعلاً مع أن التعلیم القولي أیضا کان کافیا له" (فیض الباري: ج/۲، ص/۸۹)

یعنی حضرت عمر بن عبد العزیز نے سوچا کہ آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے رتبۃً بڑھے ہوئے ہیں پھر آپ نے حضرت جبرئیل کی اقتدا کیسے فرمائی؟ یعنی تعلیم فعلی کا انہوں نے انکار کیا تعلیم قولی کا انکار نہیں فرمایا: لأنه هو المشهور لایخفی علی أحد، فکیف یخفی علی مثل عمر بن عبد العزیز.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(محل امتحان نمبر:۲) مسئلة الباب

اس باب میں حضرت عروہ بن الزبیر نے حضرت عائشہؓ کی روایت ذکر فرمائی ہے اس سے مسئلہ تعجیل عصر پر انہوں نے استدلال کیا ہے، لہٰذا یہاں تعجیل عصر کا بیان ہوگا کہ یہ بہتر ہے یا تاخیر مستحب ہے؟۔

تعجیلِ عصر:

ائمہ ثلاثہ: امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ تعجیل عصر افضل ہے اور حضرت الامام ابوحنیفہؒ، حضرات صاحبینؒ اور ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اصفرارِ شمس سے پہلے تک تاخیر افضل ہے۔

دلائل:

ائمہ ثلاثہ حدیثِ باب یعنی حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال فرماتے ہیں:

إن رسول الله صلى الله وسلم كان يصلى العصر والشمس في حجرتها قبل أن تظهر. (مؤطا امام مالک: ص۲)

(۱) وفي رواية مسلم ولم تظهر الفي من حجرتها. (مسلم شریف: ۱/۲۲۲)

(۲) ورواية أبي هريرة: وفيه والعصر والشمس مرتفعة بيضاء نقية الخ.

(مؤطا امام مالک: ص۲)

(۳) عن رافع بن خديج يقول: كنا نصلى العصر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم ننحر الجزور فنقسم عشر قسم ثم نطبخ فنأكل لحما نضيجا قبل مغيب الشمس.

(مسلم شریف: ج۱، ص۲۲۵، مشکوٰۃ شریف: ص۶۰)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلائلِ احناف:

قال الإمام: المستحب هو التاخير مادامت الشمس بيضاء نقية لم يدخلها تغير، في الشتاء والصيف جميعًا. (كما في البدائع: ص۳۲۲)

۱- امام صاحبؒ کی دلیل حدیث ام سلمہ ہے: انها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم أشد تعجيلاً للظهر منكم وأنتم أشد تعجيلاً للعصر منه. (ترمذی شریف: ج۱، ص۴۲)

۲- عن علي بن شيبان قال قدمنا على رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة فكان يؤخر العصر مادامت الشمس بيضاء نقية. (ابوداؤد: ج۱، ص۵۹)

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کو تاخیر سے ادا فرماتے تھے۔

۳- اور مجمع الزوائد اور مسند احمد کی روایت سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ آپ تاخیر کا حکم فرماتے تھے۔ عن رافع بن خديج قال: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يأمر بتاخير صلوٰة العصر. (مجمع الزوائد: ج۱، ص۳۰۷)

۴- حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تاخیر سے عصر کی نماز ادا فرماتے تھے جیسا کہ ابن ابی شیبہ نے ابوعون سے روایت کیا ہے، پس ثابت ہوا کہ تاخیر صلوٰۃ عصر مستحب ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ تاخیر سے ادا کرنے میں تکثیر نوافل ہے۔ کما في الهداية: ولأن في التاخير تكثير للنوافل؛ لأن النافلة بعدها مكروهة فكان التاخير أفضل ولهذا كان التعجيل في المغرب أفضل؛ لأن النافلة قبلها مكروهة.

حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں تاخیر عصر ہمارے یہاں افضل ہے اور اس سلسلہ میں آثارِ مرفوعہ وارد ہوئے ہیں، فقال: وبذلك جاءت عامة الآثار وهو قول أبي حنيفةؒ.

نیز عصر کو عصر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اسے تاخیر سے ادا کیا جاتا ہے قال الإمام

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

محمدؒ: وقد قال بعض الفقهاء: إنما سميت العصر لأنها تعصر وتؤخر.
(مؤطا امام محمد: ص ۲۶)

جمہور کے استدلال کا جواب:

ائمہ ثلاثہ نے تعجیل عصر پر حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے: إنه كان يصلي العصر والشمس في حجرتها إلخ

اس کے جواب میں حضرت امام طحاویؒ فرماتے ہیں: قد يجوز أن يكون ذلك كذلك، وقد أخر العصر لقصر حجرتها فلم تكن الشمس تنقطع منها إلا بقرب غروبها فلا دلالة في هذا الحديث على تعجيل العصر.

(طحاوي شريف: ج۱، ص۱۱۴)

علّامہ عینی نے بھی یہی جواب دیا ہے، مگر امام طحاویؒ کے جواب کی صحت کا مدار اس پر ہے کہ یہ ثابت ہو جائے آپ کے حجرۂ مبارکہ کی دیواریں بڑی نہ ہوں تو اس سلسلہ میں بخاری شریف جلد اوّل، صفحہ ۱۰۱ میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: عن عائشة قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل في حجرته وجدار الحجرة قصير فرأى الناس شخص النبي صلى الله عليه وسلم.

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جب میں قریب البلوغ تھا اور حضور علیہ السلام کے گھر میں جاتا تھا تو حجرے کی چھت کو میں ہاتھ سے چھو لیتا تھا۔ (کما فی العینی: ص ۵۳۹)

وقال في البدائع فقد كانت حيطان حجرتها قصيرة.

(البدائع: ص ۳۲۵)

نیز حدیث الباب سے ائمہ ثلاثہ کا استدلال کسی طرح بھی درست نہیں؛ کیونکہ اس کی دو صورتیں نکلتی ہیں حجرہ مسقّف ہو یا غیر مسقّف ہو، حجرہ کا اطلاق بناء مسقّف پر ہونا اصل ہے اور کبھی کبھی غیر مسقّف پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے پس یا تو بناء مسقّف مراد لیا

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جائے یا بناء غیر مسقّف، ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہاں بناء مسقّف مراد ہے، لہٰذا اگر یہی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جب تک حضرت عائشہؓ کے کمرہ میں دھوپ رہتی تھی آپ علیہ وسلم ﷺ نماز پڑھتے تھے اور حضرت عائشہؓ کے کمرہ کا دروازہ مغرب میں تھا اور چھت نیچی تھی اور دروازہ چھوٹا تھا پس کمرہ کے اندر دھوپ اسی وقت آسکتی ہے جب سورج جانبِ غروب میں کافی نیچے آ گیا ہو، لہٰذا تعجیل ثابت نہیں ہوتی بلکہ تاخیر کا ثبوت ہو رہا ہے۔

اور اگر بناء غیر مسقّف مراد لیں جیسا کہ علّامہ سمہودیؒ نے فرمایا ہے کہ یہاں بناء غیر مسقّف مراد ہے (كما في وفاء الوفاء في دار مصطفى: ص۳۲۵) تو اس صورت میں دھوپ کے داخل ہونے کا راستہ چھت ہوگا یعنی چھت کی طرف سے دھوپ کمرہ کے اندر داخل ہوتی رہی ہوگی اور چونکہ دیوار چھوٹی تھی اس لیے بہت دیر بعد دھوپ دیوار پر چڑھتی تھی اور دھوپ اکثر حجرہ کے اوپر ہی رہتی تھی اور جس وقت دیوار پر چڑھتی تھی وہ آخر وقت ہوتا تھا، لہٰذا اس سے بھی تاخیر ہی ثابت ہوتی ہے۔

دوسری روایت جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے اس سے بھی جمہور کا استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ دو فرسخ یا تین فرسخ چلنا کوئی امر محال نہیں ہے۔

اور رافع بن خدیج کی روایت سے متعلق علّامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ قصائی آج بھی بعد العصر یہ عمل کر سکتے ہیں؛ کیونکہ عرب کی عادتوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ نیم طبخ گوشت کھاتے ہیں ایسا عمل، گو ہم عجمیوں کے لیے مشکل ہے ان کے لیے نہیں:

”فقال ابن الهمام: إذا صلى العصر قبل تغير الشمس أمكن في الباقي إلى الغروب مثل هٰذا العمل ومن شاهد المهرة من الطباخين مع الرؤساء لم يستبعد ذٰلك“.

اور ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ عمل عام زمانہ کا نہیں ہے بلکہ اوقاتِ صیف کے ساتھ خاص ہے ”فقال: ولعله كان في أوقات الصيف“. (المرقات: ج۲، ص۱۳۶)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(محل امتحان نمبر:۳) التغليس في الفجر

عن مالک عن زيد بن أسلم عن عطاء بن يسار أنه قال: جاء رجل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فسأله عن وقت صلوٰة الصبح الخ.

عن عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي الصبح فينصرف النساء متلففات بمروطهن الخ.

تشریح:

پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص حضور پاک ﷺ کی بخدمت حاضر ہوا اور فجر کی نماز کے وقت کے بارے میں دریافت فرمایا تو آپ ﷺ نے سکوت فرمایا یعنی تعلیم قولی سے سکوت فرمایا اور آئندہ کل آپ نے تعلیم فعلی فرمائی اور دوسرے دن صبح صادق کے وقت نماز پڑھائی اور تیسرے دن فجر کی روشنی میں نماز پڑھائی اور آپ نے سائل سے فرمایا کہ ان دونوں وقتوں کے درمیان فجر کا وقت ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت میں بھی فجر کے وقت کا بیان ہے کہ عورتیں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے چادروں میں لپٹی ہوئیں واپس ہوتی تھیں اور غلس کی وجہ سے پہچانی بھی نہیں جاتی تھیں۔

متلففات: چادر اوڑھنا تلفف سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ چادر اوڑھنے کے ہیں اور امام بخاری نے ''باب وقت الفجر: ج۱/ص۸۲'' پر لفظ متلفعات نقل فرمایا ہے اس کے بھی معنیٰ چادر اوڑھنے کے ہیں، بعض حضرات نے اس طور پر فرق بیان کیا ہے کہ لفافہ کا اطلاق صرف ثوب پر ہوتا ہے اور لفاع ثوب اور غیر ثوب دونوں پر بولا

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جاتا ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ لفافہ اسے کہا جاتا ہے جس سے سر ڈھک جائے اور لفاع اسے کہتے ہیں جس سے سر نہ ڈھکے۔

بمروطهن: مروط مرط کی جمع ہے مرط بکسر میم، اون یا خز کا کپڑا'' وقیل: هي الازار، وقيل: كساء من صوف مربع سداه شعر''۔

مايعرفن من الغلس: الغلس لغة: ظلمة الليل اور اس تاریکی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو طلوعِ فجر کے بعد دیر تک چھایا رہتا ہے قال ابن الأثير: ظلمة آخر الليل إذا اختلطت بضوء الصباح اور یہاں یہی مراد ہے۔

(وهكذا في المرقات: ج۲، ص۱۳۲)

المذاهب في الوقت المستحب للفجر:

تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ ابتداء وقت فجر صبح صادق اور انتہائے وقت طلوعِ فجر ہے یعنی ابتداء وقت اور انتہائے وقت میں ائمہ متفق ہیں البتہ وقت مستحب میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ: تغليس بالفجر یعنی تاریکی میں فجر کی نماز پڑھنا افضل ہے وقال الإمام الأعظم: الإسفار بصلوة الفجر أفضل. (كما في البدائع: ج۱، ص۳۳۲)

دلائل:

جمہور ائمہ ثلاثہ حدیث باب یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں:

۱۔ أنها قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى الصبح فينصرف النساء متلففات بمروطهن مايعرفهن من الغلس.

(مؤطا امام مالک: ص۲)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

۲۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی روایت: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم صلّى الغداة فغلس بها ثم صلاها فأن سفر، ثم لم يعد الى الإسفار حتى قبضهُ الله عز وجل. رواه الطحاوي وابوداؤد واللفظ لفظ الطحاوي أما اللفظ لأبي داؤد: صلى الصبح مرة بغلس ثم صلى مرة آخرى فاسفر بها ثم كانت صلوٰته بعد ذٰلک التغليس حتىٰ مات لم يعد إلى أن يسفر.

(ابو داؤد باب المواقيت: ج۱، ص۵۷)

۳۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ غلس میں نماز پڑھتے تھے، لہٰذا مذکورہ احادیث اور فعل صحابہ (ابوبکرؓ اور عمرؓ) سے بھی ثابت ہوا کہ فجر میں تغلیس افضل ہے۔

دلائلِ احناف:

۱۔ قال الله عز وجل: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا.
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ سے قبلیت قریبی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ طلوعِ شمس سے تھوڑی دیر پہلے نماز پڑھیے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اسفار میں نماز پڑھی جائے۔

۲۔ عن رافع بن خديج عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أسفروا بالفجر، فإنه أعظم للأجر. (ترمذی شریف: ج۱، ص۴۰)
یہ روایت اصح مافی الباب اور اپنے مقصد میں صریح ہے۔

(کما في هامش مؤطا امام محمد التعليق المجد)

۳۔ عن ابن مسعود قال مارأيت النبي صلى الله عليه وسلم صلى صلاة لغير ميقاتها إلا صلاتين جمع بين المغرب والعشاء وصلى الفجر قبل ميقاتها. (البخاری: ج۱، ص۲۲۸، ومسلم: ج۱، ص۲۱۷)
حدیث پاک میں بیان ہے کہ آپ ﷺ نے فجر کی نماز اپنے مقررہ وقت سے پہلے ایک مرتبہ ادا فرمائی یہاں صرف قبلیت از وقت کا بیان ہے اور وقت کیا ہے اس کا

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

بیان یہاں نہیں ہے، اسی حدیث کی تشریح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں: المراد قبل وقتها وقتها المعتاد، لاقبل طلوع الفجر. (نووی: ج۱، ص۴۱۷)

اس سے بھی وقت میعاد کی تعیین نہیں ہوتی ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ بات ثابت ہوئی کہ یہاں حدیث میں قبل وقتها سے قبل طلوع الفجر کے علاوہ مراد ہے۔ ایک روایت میں ہے: قبل وقتها بغلس الخ: یعنی قبل از وقت کا نام غلس رکھا تو ظاہر ہے کہ غلس اسفار سے پہلے ہوتا ہے، لہٰذا یہاں اسفار مراد ہوگا فسمی التغليس صلاة قبل الميقات فعلم أن العادة كانت الإسفار. (كما في البدائع: ج۱، ص۳۲۲)

۴۔ حديث أبي برزة: وفيه ان النبي صلى الله عليه وسلم كان ينصرف من صلاة الغداة حين يعرف الرجل جليسه. وفي رواية: ينقل من صلاة الغداة.

وهٰكذا روايات كثيرة من الصحابة. مثل: على وعمر و ابوبكر وابومسعود وابومعاوية وعن التابعين. مثل: ابراهيم النخعي وغيرة أنهم كانوا يسفرون في الفجر حتى المقتديين خافوا ان الشمس هل طلعت؟ (كما في اوجز المسالك: ج۱، ص۱۵۰)

الجواب عن دلائل الخصم:

احناف حدیث باب یعنی حضرت عائشہؓ کی روایت: "كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى الصبح فينصرف النساء متلففات بمروطهن مايعرفن من الغلس" کا جواب دیتے ہیں کہ: (۱) لفظ "من الغلس" مدرج من الراوی ہے یعنی یہ حضرت عائشہؓ کا قول نہیں ہے بلکہ حضرت عائشہؓ کا قول "مايعرفن" پر ختم ہوگیا ہے، جیسا کہ امام طحاوی نے اس روایت کو بیان کیا ہے اور من الغلس کے الفاظ نہیں ہیں۔ (کمافی الطحاوی: ص۱۰۴)

نیز ابن ماجہ میں بہ سند صحیح یہ روایت ہے اور "من الغلس" کے مدرج ہونے کی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلیل ملتی ہے جیسا کہ روایت ہے: عن عروة عن عائشة قالت: كنا نساء المؤمنات يصلين مع النبي صلى الله عليه وسلم صلوٰة الصبح ثم يرجعن إلى اهلهن فلا يعرفن أحد. تعني من الغلس.

(ابن ماجه باب وقت صلوٰة الفجر: ص۴۹)

۲۔ یہاں لفظ تعني من الغلس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ راوی کا گمان ہے حضرت عائشہؓ کا منشا تو یہ تھا کہ عورتیں چادر میں لپٹی ہوئی آتی تھیں اس لیے انہیں کوئی نہیں پہچان پاتا تھا، کسی راوی نے یہ سمجھا کہ عدمِ معرفت کی وجہ غلس ہے اس لیے غلس کا اضافہ فرمادیا۔

۳۔ اور اگر "من الغلس" کو حدیث ہی کا ٹکڑا مان لیا جائے تب بھی شافعیہ کا اس سے استدلال تام نہیں ہوتا؛ کیونکہ اس زمانہ میں مسجد نبوی کی دیواریں نیچی تھیں، کھڑکیاں نہیں تھیں تو اگرچہ اسفار ہوگیا ہوتا تھا مگر اندر اندھیرا ہی رہتا تھا، جس کی وجہ سے پہچاننا مشکل تھا۔

۴۔ معرفتِ شخصی اسفار کے منافی نہیں ہے۔

۵۔ كان التغليس لعذر الخروج إلى السفر یعنی یہ عمومی احوال کا بیان نہیں ہے؛ بلکہ جب سفر کا ارادہ ہوتا تھا تو آپ غلس ہی میں نماز پڑھ لیتے تھے۔

۶۔ علامہ کاسانی صاحب بدائع الصنائع فرماتے ہیں کہ حدیث تغلیس منسوخ ہے یعنی ابتدائے زمانہ میں نئے نئے احکام کا نزول ہوتا تھا جس کے سیکھنے کے لیے آپ نے عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی، تب آپ ﷺ غلس ہی میں نماز پڑھایا کرتے تھے اور جب ممانعت ہوگئی تو غلس میں نماز کا حکم بھی ختم ہوگیا۔ فقال:

كان ذٰلك في الإبتداء حين كانت النساء يحضرن الجماعات. ثم لما أمرن بالقرار في البيوت انتسخ ذٰلك. (البدائع: ج۱، ص۲۲۴)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

ائمہ ثلاثہؒ کے دوسرے مستدل کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث یعنی ابو مسعود انصاریؓ کی روایت طویل روایت ہے اور امام ابوداؤد نے خود ہی مواقیت والے حصہ کو معلول قرار دیا ہے؛ کیونکہ اسی حدیث کو امام مالک، سفیان بن عیینہ اور ان کے علاوہ دیگر حفاظِ حدیث نے بھی روایت کیا ہے اور کسی نے بھی اس ٹکڑے کو بیان نہیں کیا ہے، یہ صرف اُسامہ بن زید لیثی کا تفرد ہے۔ نیز ابن خزیمہ نے بھی اُسامہ بن زید لیثی کا تفرد قرار دیا ہے۔ فقال: هٰذهِ الزيادة لم يقلها احد غير أسامة بن زيد. (صحیح ابن خزیمہ: ج۱، ص۱۸۱، وکذا في فتح الباری: ج۲، ص۵)

لہٰذا معلول روایت سے استدلال درست نہیں ہوگا۔

جمہور کے تیسرے مستدل یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے فعل سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ غلس ہی میں نماز شروع فرماتے اور غلس ہی میں ختم بھی فرمادیتے تھے، ہوسکتا ہے کہ ابتداء غلس میں فرماتے ہوں اور اختتام اسفار میں۔ اور یہ مذہب احناف کے منافی نہیں، امام محمدؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، امام طحاویؒ کا بھی مختار مذہب یہی ہے۔

(محل امتحان نمبر:۴) من أدرك ركعةً من الصبح

عن مالك بن أسلم عن عطاء بن يسار، وعن بسر بن سعيد وعن الأعرج، كلهم يحدثهُ عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ادرك ركعة من الصبح قبل أن تطلع الشمس فقد أدرك الصبح، ومن ادرك ركعة من العصر قبل أن تغرب الشمس فقد ادرك العصر. (ص:۳)

حاصل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا پاک ارشاد

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

ہے کہ جس نے فجر کی نماز کی ایک رکعت پالی، اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے عصر کی ایک رکعت پالی، اس نے عصر کی نماز پالی۔

اس حدیث کے ظاہر پر اتفاق نہیں ہے، یعنی اس کا ظاہر تو یہ تقاضا کرتا ہے کہ طلوعِ شمس اور غروبِ شمس سے پہلے جس نے بھی نماز کی ایک رکعت پالی تو اس نے ساری نماز پالی، اب اسے پورا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، البتہ اس کے اخیر جزء پر اتفاق ہے کہ جس نے عصر کی ایک رکعت کو وقت کے اندر پڑھا اور بقیہ رکعت بعد غروب الشمس پڑھا تو نماز ہو جائے گی۔ تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے، البتہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ نماز فاسد ہو جائے گی۔

حدیث کے پہلے جزء ''من أدرک رکعة من الصبح فقد أدرک الصبح'' کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ (احناف اور ائمہ ثلاثہ کا اختلاف ہے)

ائمہ ثلاثہ:

امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح بعد غروب الشمس نماز فاسد نہیں ہوتی، بعد الطلوع بھی نماز فاسد نہ ہوگی یعنی یہ حضرات عصر اور فجر میں عدمِ تفریق کے قائل ہیں۔

حضرت الامام الاعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ عصر میں تو نماز ہو جائے گی اور فجر میں نماز باطل ہو جائے گی، وبه قال الإمام محمد.

دلائل:

ائمہ ثلاثہ، حدیث باب ''من ادرک رکعة من الصبح الخ'' سے استدلال فرماتے ہیں کہ حدیث مذکور میں صلوٰۃ عصر اور صلوٰۃ فجر کا ایک ہی حکم بیان کیا گیا ہے فرق بیان نہیں کیا گیا ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

۲۔ وفي رواية للبخاري: من ادرک سجدة من صلاة الصبح قبل أن تطلع الشمس فليتم صلاته. (البخاری: ج ۱، ص ۷۹)

دلائل احناف:

قال أبو هريرة رضي الله عنه: أن خشيت من الصبح فواتًا فبادر بالركعة الأولى الشمس، فإن سبقت بها الشمس فلا تعجل بالأخر.

(کما في كنز العمال: ج ۴، ص ۲۲۸)

یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا فتویٰ ہے جبکہ ائمہ ثلاثہ کی دلیل بھی ابو ہریرہؓ ہی کی روایت ہے، لہٰذا عند التعارض فتویٰ پر عمل کیا جائے گا۔

۲۔ عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايتحرىٰ أحدكم فيصلي عند طلوع الشمس ولاعند غروبها. اس حدیث سے عند الطلوع اور عند الغروب ادائیگی صلوٰۃ سے ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

نیز وہ تمام احادیث بھی احناف کی دلیل ہیں جن میں اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عند الاحناف کوئی ایسی صریح دلیل موجود نہیں ہے جس سے اپنے مسلک پر استدلال تام ہو سکے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت: ”من ادرک رکعة من الصبح الخ“ کی احناف نے تاویلیں کی ہیں، مگر ہر تاویل پر کچھ نہ کچھ اشکال ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب البحر الرائق کا رُجحان بھی صحتِ صلوٰۃ مع الکراہت کی طرف ہے؛ مگر عام کتبِ احناف سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نمازوں کے درمیان فرق ہے؛ لہٰذا حدیث ابی ہریرہؓ کی تاویل کی جائے گی۔

امام طحاویؒ کی توجیہ:

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں وجوبِ صلوٰۃ کا بیان ہے، تفصیل اس کی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

یہ ہے کہ اگر ایسے وقت میں بچہ بالغ ہوجائے کہ ایک رکعت نماز ادا کرسکتا ہے تو اس پر نماز فرض ہوگئی۔ اسی طرح اگر ایسے وقت میں حائضہ پاک ہوجائے، مجنون کو افاقہ ہوجائے یا کافر مسلمان ہوجائے اور ایک رکعت کی ادائیگی کے بقدر وقت ہے تو وہ نماز اس پر واجب ہوگئی۔

فالتقدير عند الطحاوي: من أدرک وقت رکعة قبل أن تطلع الشمس فقد ادرک وجوب صلوٰة الصبح ومن أدرک وقت رکعة قبل أن تغرب الشمس فقد أدرک وجوب صلوٰة العصر یعنی ادرك رکعة میں رکعة سے قبل ''وقت'' کو اور صلوٰۃ الصبح سے قبل ''وجوب'' کو مقدر مانا جائے گا۔

اشکال: امام طحاویؒ کی اس توجیہ پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ حکم تو صلوٰۃ خمسہ کے ساتھ عام ہے پھر بالتخصیص ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: ان دونوں وقتوں میں خروجِ وقت بالکل واضح ہے اس لیے خاص طور سے اس کو ذکر کیا ہے ورنہ یہ حکم عام ہے۔

اشکال: مگر اس توجیہ سے کام نہیں چلتا؛ کیونکہ یہ توجیہ تو ان احادیث میں چل سکتی ہے جن میں اِتمام کی صراحت نہیں ہے۔ اور جن روایات میں اس کی صراحت ہے وہاں یہ توجیہ مفید نہیں ہے۔ مثلاً دارقطنی (ج:۱،ص:۳۸۲) پر ''فليتم صلوٰته'' اور بیہقی کی سننِ کبریٰ (ج:۱،ص:۳۷۹) پر ''فليصل إليها أخرىٰ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ پس یہ توجیہ قابلِ قبول نہیں۔

جواب: جواب یہ ہے کہ ''فليتم'' کے معنیٰ ہیں: فلياتِ به على وجه اتمام في وقت أخر. یعنی بعد میں قضاء کرنے کو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

دیگر توجیہات:

حدیث ابی ہریرہؓ کی اور دیگر توجیہات کی گئی ہیں، مثلاً: ملّا علی قاریؒ نے مرقاۃ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

شرح مشکوۃ میں فرمایا: معناہ: فقد أدرک فضیلة الجماعة (مرقاۃ: ج۲/، ص/۱۴۴) اس توجیہ پر بھی ''فلیتم'' کے الفاظ سے اشکال ہوتا ہے۔ اس کا جواب بھی ملّا علی قاریؒ نے تحریر فرمایا ہے: ''ومعنٰی قوله: ''فلیتم صلٰوته'': أي بالقضاء عندنا بأن یعیدها''. (المرقاۃ: ج:۲، ص:۱۳۵)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں: احادیث اباحت، احادیث نہی سے منسوخ ہے، فیحتمل أن یکون مافیه الإباحة هو منسوخ بمافیه النهی.

علّامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ تعارض احادیث کی وجہ سے قیاس کی طرف ہم رجوع کریں گے اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ صلوٰۃ فجر اور صلوٰۃ عصر کے درمیان فرق ہو اور قیاس یہ ہے کہ فجر کا پورا وقت کامل ہے اس میں کوئی وقت ناقص نہیں ہے؛ لہٰذا جو آخر وقت میں فجر کی نماز پڑھے گا اس پر وجوب کامل ہوا؛ کیونکہ وقت کامل میں یہ عمل میں لگ رہا ہے۔ اور جب سورج طلوع ہوگیا تو اب وجوبِ کامل کی ادائیگی وقت غیر کامل میں ہورہی ہے اس لیے کہ فجر کا وقت کامل قبل طلوع الشّمس ہے اور بعد الطلوع وقت ہے ہی نہیں اور جب وجوبِ کامل کی ادائیگی وقت ناقص میں ہو تو وہ مفسدِ صلوٰۃ ہوگی۔

لہٰذا فجر کی نماز بعد الطلوع فاسد ہوجائے گی۔ برخلاف عصر کے، کہ اس کے دو اوقات ہیں قبل الاصفرار وقت کامل ہے اور اصفرار سے غروب تک کا وقت ناقص ہے، پس جب کسی نے آخر وقت میں نماز شروع کی تو اس پر وجوب بھی ناقص ہوا اور وجوب کی ادائیگی بھی ناقص وقت میں ہورہی ہے، اس لیے کوئی معارضہ نہیں۔ یہاں نماز صحیح ہوجائے گی۔

حضرت شیخ زکریاؒ کی رائے گرامی:

حضرت شیخ الحدیث زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے نمازِ عصر اور نمازِ فجر کے درمیان اس طور پر فرق بیان کیا ہے:

قال: والأوجه عندی في وجه ترجیح جواز العصر دون الفجر: ان

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

ظاهر قوله تعالیٰ: ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ'' یبیح الصلوٰۃ فیها. (أوجز المسالک: ج:۱، ص:۱۰، مکتبہ سہارنپور)

یعنی جوازِ عصر پر اللہ پاک کا قول: ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ الخ'' دلیل ہے، اس سے جوازِ عصر ثابت ہوتا ہے اور جوازِ فجر پر دلیل نہیں ہے اس لیے وہاں فسادِ صلوٰۃ کا حکم لگایا گیا اور یہاں صحتِ صلوٰۃ کا۔ اور بھی دیگر توجیہات اور تاویلات کی گئی ہیں جن میں طویل بحث ہے ان کو اختصاراً ترک کیا جاتا ہے۔

(محل امتحان نمبر:۵) التعجیل بالظهر

عن مالک عن نافع مولیٰ عبد بن عمر، ان عمر بن الخطاب کتب إلیٰ عُمّالِه إنَّ أهمَّ امرکم عندي الصلوٰة. فمن حفظها فحافظ علیها حفظ دینه، ومن ضیعها فهو وماسواها یضیعُ. ثم کتب: أن صلوا الظهر إذا کان الفئ ذراعًا إلیٰ أن یکون ظل أحدکم مثلهٗ. والعصر والشمس مرتفعة بیضاء نقیة. قدر مایسیر الراکب فرسخین أوثلثة قبل غروب الشمس. والمغرب: إذا غربت. والعشاء: إذا غاب الشفق إلیٰ ثلث اللیل. فمن نام فلانامت عینه. فمن نام فلانا مت عینه. فمن نام فلانا مت عینه. والصبح: والنجوم بادیة مشتبکة. (مؤطا إمام مالک:۳)

حاصلِ حدیث یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے عمال کو تحریر بھیجی کہ میرے نزدیک تمہارے تمام فرائض میں سے سب سے اہم فرض نماز ہے، جس نے اس کے ارکان وآداب اور مستحبات کی رعایت کے ساتھ اس کی حفاظت کر لی تو اس نے اپنے دین کے بقیہ فرائض کی حفاظت کر لی اور جس نے نماز کو ضائع کر دیا تو وہ نماز کے علاوہ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دیگر فرائض کو بھی زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا (اس کے بعد اوقاتِ صلوٰۃ بتلاتے ہوئے تحریر فرمایا کہ) ظہر کی نماز اس وقت پڑھو جبکہ سایہ ایک گز کا ہو یہاں تک کہ وہ سایہ تمہارے (کسی بھی آدمی کے) قد کے برابر ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ سایۂ اصلی کے سوا سایہ ایک مثل کا ہو جائے۔ اور عصر اس وقت ادا کرو جبکہ سورج اس قدر صاف اور چمک دار ہو کہ سوار دو فرسخ یا تین فرسخ کی مسافت غروبِ شمس سے پہلے پہلے طے کرلے۔ اور غروبِ شمس جب ہو جائے تو مغرب کی نماز پڑھو اور عشاء کی نماز اس وقت پڑھو جب شفق غائب ہو جائے یہاں تک کہ رات کا تہائی حصہ گزر جائے۔ اور جو شخص عشاء سے قبل سو گیا اللہ کرے اس کی آنکھ نہ لگے (تین مرتبہ اس جملہ کو لکھا) اور صبح کی نماز جب تارے نمایاں اور گنجان ہو جائیں تب پڑھو۔

تشریح:

اس طویل حدیث کے تحت پانچ مسائل ذکر کیے جائیں گے:

(۱)۔ تعجیل بالظہر۔ (۲)۔ انتہاء وقت مغرب۔

(۳)۔ تعیین شفق۔ (۴)۔ وقت عشاء۔

(۵)۔ النوم قبل العشاء، بالترتیب ان شاء اللہ پانچوں مسائل ذکر کیے جائیں گے۔

المذاهب في التعجيل بالظهر:

(۱) حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں تعجیل ظہر افضل ہے۔

(۲) حضرت الامام اعظم ابوحنیفہؒ اور حنابلہ فرماتے ہیں کہ افضلیت زمانہ کے اعتبار سے ہے پس ایامِ شتاء میں تعجیل اور ایامِ صیف میں تاخیر افضل ہے کما في الهداية: الإبراد في الصيف وتقديمه في الشتاء.

(الهداية: ج:۱، ص:۸۳ وكذا في البدائع: ج:۱، ص:۳۲۴)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلائل:

امام شافعیؒ کا استدلال حدیثِ باب سے ہے ''فيه: ثم كتب أن صلوا الظهر إذا كان الفئى ذراعًا الخ''۔ یہی روایت موطا امام محمد میں اس طرح ہے: ''صل الظهر إذا كان ظلك مثلك'' (موطا امام محمد: ص:۴۱)

حدیثِ مذکورہ میں ایک مثل تک سایہ پہنچ جانے پر ظہر کی نماز پڑھنے کا حکم ہے جس سے تعجیل ثابت ہوتا ہے اور عدمِ فرق فی الصیف والشتاء پر، امام شافعیؒ کا استدلال حدیث خباب سے ہے: ''قال: أتينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فشكونا إليه حرا الرمضاء فلم يشتكنا الخ''۔ (مسلم شریف: ج:۱. ص:۲۲۵)

دلائل احناف:

۱۔ عن أبي هريرة رضي الله عنه: إذا اشتد الحر فابردوا عن الصلوة فإن شدة الحر من فيح جهنم. (بخاري: ج:۱. ص:۷۶. مؤطا امام مالک: ص:۶)

۲۔ عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا اشتد البرد بكر بالصلوة وإذا اشتد الحر أبرد بالصلوة.

۳۔ عن عطاء بن يسار ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان شدة الحر من فيح جهنم فإذا اشتد الحر فابردوا عن الصلوة.

جواب:

امام شافعیؒ نے حدیث الباب سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو ظہر کی نماز اس وقت تک پڑھنے کا حکم فرمایا جبکہ سایہ (سایہ اصلی کے سوا) ایک مثل کا ہو جائے۔ اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ تو امام شافعیؒ کے یہاں انتہاء وقت ظہر ہے اور ہماری گفتگو اس سلسلہ میں نہیں ہے۔ والاختلاف في إبتداء الظهر سيأتي إن شاء الله

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

تعالیٰ، پس جب ایک مثل سایہ کا گزر جانا امام شافعیؒ کے یہاں آخر وقت ہے اور حضرت عمرؓ نے اسی وقت میں نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے تو اس سے تاخیر ثابت ہوتی ہے نہ کہ تعجیل۔

امام شافعیؒ کی دوسری دلیل (حدیثِ خبابؓ) کا جواب یہ ہے کہ:

۱۔ یا تو حدیثِ خبابؓ منسوخ ہے۔

۲۔ یا نہیں تو اس کی تاویل کی جائے گی۔ تاویل اس کی یہ ہوگی کہ صحابہ کرامؓ نے مقدار ابراد سے زائد مقدار کا مطالبہ کیا تھا جس کی آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی۔ کما في النووي: أو محمول على أنهم طلبوا تاخيراً زائداً على قدر الابراد.

(شرح مسلم للنووی: ج:۱، ص:۲۲۴)

اور نسخ کا بیان کرتے ہوئے حضرت امام طحاویؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث (حدیثِ خبابؓ) منسوخ ہے اور ناسخ حدیثِ مغیرہؓ ہے۔ قال: صلّى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة الظهر بالهجير، ثم قال: إن شدّة الحرّ من فيح جهنم الخ.

قال الطحاوي: فثبت بذلک نسخ تعجيل الظهر في شدة الحر، ووجب استعمال الإبراد في شدة الحرّ. (الطحاوي: ج:۱، ص:۱۱۱)

(محل امتحان نمبر:۶) انتہائے وقت مغرب

جمہور ائمہ حتیٰ کہ امام شافعیؒ کا بھی مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ انتہائے وقت مغرب، غروبِ شفق ہے، یعنی جب شفق غروب ہو جائے تو وقت مغرب ختم ہو جاتا ہے اگرچہ امام شافعیؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ مغرب کا وقت صرف اتنا ہی ہے کہ اذان و اقامت اور پانچ رکعت نماز پڑھی جا سکے: للمغرب وقت مضيق وهو قدر وضوء وأذان وإقامة وخمس ركعات متوسطات؛ لحديث ابن عباس. (الترمذي: ج:۱، ص:۳۸)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

یہاں اسی قول جدید سے بحث ہوگی۔ جمہور فرماتے ہیں کہ غروبِ شفق تک مغرب کا وقت ہے۔

دلائل:

امام شافعیؒ کا استدلال امامتِ جبرئیلؑ والی حدیث سے ہے، فإن جبرئیل صلاها في اليومين في وقت واحد. (المرقات: ج:۲، ص:۱۲۰، هدایه: ج:۱، ص:۸۱)

جمہور کا استدلال حضرت بریدہؓ کی روایت سے ہے: "وصلى المغرب قبل أن يغيب الشفق". (مشکوٰۃ: ج:۱، ص:۵۹، مسلم: ج:۱، ص:۲۲۳)

الجواب:

۱۔ امام شافعیؒ کے مستدل کا جواب صاحبِ ہدایہ دیتے ہیں: وما رواه كان للتحرز عن الكراهة. (هدایه: ج:۱، ص:۸۱)

۲۔ صاحبِ بذل فرماتے ہیں: علامہ نووی فرماتے ہیں کہ حدیث جبرئیل مقدم ہونے کی وجہ سے منسوخ ہے۔

(البذل: ج:۱، ص:۲۲۸ وکذا فی شرح مسلم للنووی: ج:۱، ص:۲۲۲)

أحاديث الإمتداد أصح اسناداً من حديث جبرئيل فوجب تقديمها.

تعیین شفق: اختلافِ ائمہ

ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) اور صاحبینؒ فرماتے ہیں:

الشفق هو الحمرة. (نووی: ج:۱، ص:۲۲۳)

وفي الهداية: وعندهما هو الحمرة (ج:۱، ص:۸۲) یعنی ان حضرات کے یہاں شفق سے شفقِ احمر مراد ہے۔

اور حضرت الامام الاعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: الشفق هو البياض الذي في

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

الأفق بعد الحمرة. (هدایه: ج:۱، ص:۸۲)
یعنی شفق احمر کے غروب کے بعد جو روشنی اُفق پر پھیلتی ہے وہی مراد ہے یعنی شفق ابیض مراد ہے۔

دلائل:

ائمہ ثلاثہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے استدلال فرماتے ہیں: أنه قال: الشفق هو الحمرة. (دارقطني: ص:۲۰۰، هدایه: ج:۱، ص:۸۲)

۱۔ حضرت امام اعظمؒ کی دلیل حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی روایت ہے جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے: وفيه: "ويصلى المغرب حين تسقط الشمس ويصلى العشاء حين يسود الأفق". (ابوداؤد: ج:۱، ص:۵۷)

۲۔ وفي الهداية: ولأبي حنيفة قوله عليه السلام: وأخر وقت المغرب إذا اسود الأفق. (الهدایه: ج:۱، ص:۸۲)

۳۔ وفي البدائع: وإنما يسود بإخفائها الظلام. (البدائع: ج:۱، ص:۳۲۱)

۴۔ قال الله عز وجل: "وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ"
غسق لیل کو اللہ پاک نے انتہائے وقت مغرب بتلایا ہے، ولا غسق مابقي النور المعترض. (البدائع: ج:۱، ص:۳۲۱)

الجواب عن استدلال الجمهور:

حديث ابن عمر موقوف على ابن عمر كما قال صاحب الهداية: والحديث موقوف على ابن عمر. (الهداية: ج:۱، ص:۸۲)
اور احادیثِ مرفوعہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ شفق سے شفقِ احمر مراد ہے، لہٰذا مرفوع حدیث کے مقابلہ میں موقوف سے استدلال درست نہ ہوگا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

مذہبِ احناف کی وجہِ ترجیح:

دلائلِ احناف کثیر ہیں اور احادیثِ مرفوعہ ہیں۔ نیز مذہبِ احناف کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے، کما في قوله تعالیٰ: ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ'' (کمامر) نیز قیاس بھی ہمارا مؤید ہے۔ کماذکرہ الطحاویؒ

(محلِ امتحان نمبر: ۷) وقت العشاء

عشاء کے ابتدائے وقت کے سلسلہ میں امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ شفقِ ابیض کے غروب کے بعد عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے اور جمہور کے یہاں شفقِ احمر کے بعد شروع ہوجاتا ہے۔

یہ اختلاف شفق کی تعیین میں اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے وقد مر تفصیله مع ادلة الائمة. یہاں انتہائے وقت عشاء کا بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ سے اس سلسلہ میں دو قول منقول ہیں:

۱۔ انتہائے وقتِ عشاء ثلث لیل تک ہے۔

۲۔ نصف لیل تک عشاء کا وقت ہے۔

حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں صبح صادق تک اس کا وقت ہے، اگرچہ افضلیت میں تفصیل ہے کہ سردی میں تاخیر اور گرمی میں تعجیل بہتر ہے: التاخیر إلی ثلث اللیل مستحب في الشتاء وأما في الصیف فالتعجیل افضل.

دلائل:

امام شافعیؒ کی دلیل: حدیثِ باب ہے۔ (۱): ''والعشاء إذا غاب الشفق إلی ثلث اللیل''. (مؤطا امام مالک: ص:۲)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

۲۔ نعمان بن بشیر کی روایت: أنا أعلم الناس بوقت هٰذه الصلوة. كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي هي لسقوط القمر لثالثة. یہ روایات تو ثلث لیل والی روایت کی دلیل ہوئی۔

اور دوسرے قول یعنی نصفِ لیل تک وقتِ عشاء ہونے کی دلیل مسلم شریف کی روایت ہے۔ عن ابن عمر أنه قال: وقت صلوة العشاء إلى نصف الليل. وحديث أبي هريرة: وإن آخر وقتها حين ينتصف الليل. (رواه الترمذی)

حضرت الامام الاعظم ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس لکھا تھا: وصل العشاء أي الليل شئت. كماذكره الطحاوي. اس سے معلوم ہوا کہ رات جب تک باقی ہو وہ عشاء کا وقت ہے، اس کی تائید عبید بن جریج کی روایت سے ہوتی ہے، انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے فرمایا: ''مافراط صلوة العشاء قال طلوع الفجر'' یعنی طلوعِ فجر تک نماز پڑھنا درست ہے۔

جواب:

امام شافعیؒ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ نعمان بن بشیر کی روایت سے استدلال تام نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں ہے: ''انه يصليها لسقوط القمر لثالثة'' ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ شفق کے غروب کے وقت ثلث لیل متحقق نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ لیل ثانی کا تحقق ہوتا ہے: فقال: والقمر في الليلة الثانية يقرب غيبوبة الشفق دون الثالثة. فتدبر. فإنه أمر مشاهد. (المرقات: ج:۲، ص:۱۳۸)

علّامہ کاسانیؒ صاحب ''بدائع الصنائع'' فرماتے ہیں: ''الحديث محمول على زمانِ الصيف أو على حال العذر''. (البدائع: ج:۱، ص:۳۲۶)

سب سے بہترین طریقہ دفعِ تعارض بین الأحادیث کا یہ ہے کہ ایسی تطبیق دی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جائے کہ تمام احادیث پر عمل ہو سکے، لہٰذا صورتِ تطبیق بیان کرتے ہوئے امام طحاویؒ اور علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ احادیث تین طرح کی ہیں: (۱) ثلثِ لیل کی روایت۔ (۲) نصف لیل کی روایت (۳) اور الٰی طلوع الفجر کی روایت۔ تینوں کے درمیان تطبیق اس طور پر دی جائے کہ ثلثِ لیل میں نماز عشاء مستحب، نصف اللیل تک جائز اور طلوعِ فجر تک جائز مع الکراہت وبه قال الأحناف والقول الأصح للشافعي ایضًا.

(محل امتحان نمبر: ۸) النوم قبل العشاء

حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے نوم قول قبل العشاء کو مکروہ کہا ہے۔ اور حضرت الامام الاعظمؒ نے فرمایا کہ جائز ہے۔ کما في النووي شرح مسلم (ج:۱، ص:۲۲۰)

وفي الرد المحتار: ویکره النوم قبل العشاء (ج:۱، ص:۲۳۶) وکذا في نفع المفتي والسائل: ص:۱۳۸).

معلوم ہوا کہ احناف سے اس سلسلہ میں دو قول منقول ہیں:

۱۔ جواز کا

۲۔ کراہت کا۔

دلیل احناف حضرت امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ کراہت کا حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو اگر سو جائیں تو وقت نکل جانے کا خوف ہو اور جس کے اندر ایسی بات نہیں یعنی سونے کے بعد بیدار ہونے کا یقین یا غلبۂ ظن ہو تو بلا کراہت جائز ہے۔

(کماذکره في ردالمحتار: ج:۱، ص:۲۳۶)

دلیل کراہت:

حضرت امام شافعیؒ کی دلیل حضرت ابو برزہؓ کی روایت ہے۔ قال: کان النبي

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

صلى الله عليه وسلم يكره النوم قبل العشاء والحديث بعدها.

(ترمذی:ج:۱،ص:۴۲، بخاری شریف:ج:۱،ص:۸۰)

دلیل جواز:

حضرت الامام الاعظمؒ کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے: عن عائشة أن النبي صلى الله عليه وسلم اعتم ليله بالعشاء وذلك قبل أن يفشوا لإسلام، فلم يخرج حتى قال عمر: نام النساء والصبيانُ الخ.

(بخاری:ج:۱، ص:۸۰)

وكذا عن عمر بمعناه. (البخاري: ج:۱، ص:۸۱، مسلم شريف: ج:۲، ص:۲۲۸)

(محل امتحان نمبر:۹) آخر وقت الظهر

عن عبدالله بن رافع الخ. فقال أبو هريرة: أنا أخبرك صل الظهر إذا كان ظلك مثلك الخ. (مؤطا امام مالك: ص:۲، امام محمد، ص:۴۱)

حضرت امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں: ظہر کا وقت ایک مثل تک باقی رہتا ہے اور مثلِ اول کے بعد وقت عصر شروع ہو جاتا ہے۔ وهذا رواية عن الحسن عن أبي حنيفة أيضًا، واختاره الطحاوي.

امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: ظہر کا وقت دو مثل تک باقی رہتا ہے، وهو ظاهر الرواية وهو الصحيح. (كما في رد المحتار: ج:۱، ص:۲۴۰)

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ: مثل اوّل کے بعد صرف چار رکعت پڑھنے کے وقت کے بقدر ظہر کا وقت باقی رہتا ہے اور اس وقت میں عصر کی نماز بھی ادا ہو جائے گی، یعنی بقدر چار رکعت نماز پڑھنے کا جو وقت ہوتا ہے وہ وقت مشترک بین الظہر والعصر ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلیل جمہور:

۱۔ وقت الظهر إذا زالت الشمس وكان ظل الرجل كطوله.

(مسلم شریف: ج:۱، ص:۲۲۳)

۲۔ حدیث امامت جبرئیل: وفيه: فلما كان الغد صلى بي الظهر حين كان ظله مثله. (رواه ابوداؤد والترمذي)

دلیل امام اعظمؒ:

۱۔ حضرت عبداللہ بن رافع کی روایت ہے: انه سأل أبا هريرة عن وقت الصلوٰة فقال ابوهريرة: أنا أُخبرك صل الظهر إذا كان ظلك مثلك والعصر إذا كان ظلك مثليك الخ.

(موطا امام مالک: ص:۳، امام محمد: ص:۴۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انتہائے وقت ظہر مثلین ہے، یعنی مثلین تک ظہر کی نماز پڑھ سکتے ہیں اور مثلین کے بعد عصر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔

۲۔ عن أبي هريرة: إذا اشتد الحر فأبردوا عن الصلوٰة الخ. (رواه البخاري: ج:۱، ص:۷٦، والمسلم: ج:۱، ص:۲۲۴ والامام مالک: ص:٦)

اور ہدایہ میں صراحت ہے کہ جب وہاں سخت گرمی پڑتی تھی وہ وقت مثل اوّل کا وقت ہوتا تھا۔ (الہدایہ: ج:۱، ص:٦۴)

معلوم ہوا کہ مثل اوّل کے بعد جب تپش ختم ہونے کے قریب ہو اس وقت ظہر کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت امام مالکؒ کی دلیل:

حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے دوسرے دن ظہر

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

کی نماز مثل اوّل کے وقت میں پڑھائی اور عصر کی نماز بھی پہلے دن مثل اوّل کے وقت میں پڑھائی۔ معلوم ہوا کہ مثل اوّل کے بعد چار رکعت پڑھنے کے بقدر وقت مشترک بین الظہر والعصر ہے۔

جواب:

۱۔ مثل اوّل میں نماز پڑھنے کی روایت: وکان ظلّ الرجل کطوله استحباب پر محمول ہے۔

۲۔ امامتِ جبرئیل کی روایت منسوخ ہے اور ناسخ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے: إذا اشتد الحر فأبردوا الخ؛ کیونکہ امامتِ جبرئیلؑ کا واقعہ مکہ میں پیش آیا اور حدیث تبرید مدینہ میں۔ لہٰذا امامتِ جبرئیل کے واقعہ کو تقدم حاصل ہے اور حدیث تبرید مؤخر ہے اور مؤخر ہی ناسخ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نیز سنداً بھی حدیث تبرید احسن ہے فلهٔ الترجیح عند التعارض.

(محل امتحان نمبر: ۱۰) **باب وقت الجمعة**

عن مالک عن عمه أبي سهيل بن مالک عن أبيه أنه قال: كنت أرى طِنْفسةً لعقيل بن أبي طالب، الخ.

(موطا امام مالک: ص: ۲، موطا امام محمد: ص: ۱۲۷)

تشریح:

حضرت امام مالکؒ اپنے والد عامر اصبحی سے روایت کرتے ہیں کہ میں دیکھتا تھا عقیل بن ابی طالب کے لیے مسجد نبوی کی شرقی دیوار کے قریب ایک چٹائی (جو کھجور کے تنے سے بنی ہوئی تھی) ڈال دی جاتی تھی۔ اور جب سایہ دار پوری چٹائی پر آجاتا تھا تب

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

حضرت امیر المؤمنین عمر ابن الخطابؓ جمعہ کی نماز پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تھے۔

قال: ثم نرجع بعد صلوٰۃ الجمعۃ الخ۔

امام مالک (والد ابو سہیل) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد قیلولہ کرتے تھے۔ امام زرقانی فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ جمعہ کی نماز بہت جلد ادا کرلیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ لوگ جمعہ سے پہلے تو غسل اور جمعہ کی تیاری میں مشغول رہتے اور بعد الجمعہ سوتے تھے۔

المذهب في وقت الجمعة:

حضرت امام احمد صلوٰتِ جمعہ قبل الزوال کے جواز کے قائل ہیں وبہ قال اسحاق۔

جمہور ائمہ فرماتے ہیں کہ قبل الزوال صلوٰتِ جمعہ جائز نہیں۔ وأما وقته الأخير فهو وقت الظهر.

دلیل جواز:

امام احمد: (۱) حدیثِ باب سے استدلال فرماتے ہیں کہ لوگ بعد الجمعہ قیلولہ کرتے تھے اور قیلولہ کا وقت نصف النہار ہے، معلوم ہوا کہ قبل الزوال جمعہ کی نماز ہوجایا کرتی تھی۔

(۲) عن سلمة بن الأكوع: كنا نصلي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الجمعة ثم ننصرف وليس للحيطان ظل يمشي فيه.

(مسلم شریف: ج:۱، ص:۲۸۳)

(۳) عبد اللہ بن سیدان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کا طریقہ یہی تھا یعنی قبل الزوال جمعہ کی ادائیگی فرمالیتے تھے۔

(المرقاۃ ج:۳، ص:۲۶۲)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلیل جمہور:

۱۔ عن سلمة بن الأكوع قال: كنا نجتمع مع رسول الله صلى الله عليه وسلم إذ زال الشمس الخ. (مسلم: ج:۱، ص:۲۸۳)

۲۔ عن أنس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس. (البخاری: ج:۱، ص:۱۲۳)

۳۔ وہ تمام احادیث بھی جمہور کا مستدل ہیں جن میں بعد الزوال جمعہ پڑھنے کا ثبوت ہے۔

۴۔ مواظبت خلفاء راشدین سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت جمعہ کے، وقت ظہر ہونے پر اجماع ہوگیا ہے۔ (کمافی التعلیق: ج:۲، ص:۱۴۷)

جواب:

حدیثِ باب سے امام احمدؒ کا استدلال تام نہیں ہے؛ کیونکہ یہاں حقیقت کا بیان نہیں کیا گیا، بلکہ نائب پر منوب کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کما في ''الأوجز'' ج:۱، ص:۱۷) لأنه أطلق عليه اسم قائلة الضحى لما أنه قائم مقامه الخ.

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ وہاں یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ قبل الزوال ہی جمعہ کی نماز ہوجاتی تھی؛ بلکہ شدتِ تعجیل کا بیان مقصود ہے جمعًا بين الأخبار.

(کما في المرقاۃ للقاری: ج:۳، ص:۱۶۲)

تیسری دلیل یعنی عبداللہ بن سیدان کی روایت کا جواب دیتے ہوئے ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں: وأما حديث دارقطني عن عبد الله بن سيدان الخ. فقد اتفقوا على ضعف ابن سيدان. (المرقاۃ: ج:۳، ص:۲۶۲)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(محل امتحان نمبر:۱۱) باب من أدرک رکعۃ من الصلوٰۃ

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من أدرک رکعة من الصلوٰة فقد أدرک الصلوٰة. (موطا امام مالک: ص:۴، امام محمد: ص:۱۰۳ باب في الرجل يسبق ببعض الصلوٰة)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا پاک ارشاد ہے: جس نے نماز کی ایک رکعت کو پالیا اس نے پوری نماز کو پالیا۔

اجماع ظاہر حدیث کے خلاف ہے "یعنی ان مدرک رکعة لایکون مدرکا لکل صلوٰة بالإجماع" کہ ایک رکعت پالینے سے کل صلوٰۃ کو پالینے والا اقرار نہیں دیا جاسکتا، لہٰذا یہ حدیث محتاج تاویل ہے۔ چنانچہ علماء نے اس کی مختلف تاویلات فرمائی ہیں۔

تاویلات:

۱۔ احدها وأحسنها: أن من أدرک رکعة مع الإمام من أية صلوٰة كانت، فقد أدرک فضل الجماعة. یعنی خواہ کوئی بھی نماز ہو جس نے ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھ لیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ اسے جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ حتیٰ کہ امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص امام کو حالتِ تشہد میں بھی پالے تو خدا تعالیٰ اسے فضیلت جماعت سے سرفراز فرمائے گا یہ بڑی عمدہ تاویل ہے۔

۲۔ من ادرک رکعة ای رکوعًا. یعنی جس کو رکوع مل گئی اسے رکعت مل گئی۔

۳۔ من أدرک رکعة من الصلوٰة في الوقت والباقي خارجها فقد ادرک وقتها یعنی جسے ایک رکعت نماز پڑھنے کا وقت مل گیا اس پر نماز فرض ہوگئی۔ یہی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

وجہ ہے کہ ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ اگر نابالغ بالغ ہوجائے، مستحاضہ پاک ہوجائے اور کافر مسلمان ہوجائے اور اتنا وقت اسے مل جائے کہ تکبیر تحریمہ کہہ سکے تو اس پر فرضیتِ صلوٰۃ ثابت ہوجاتی ہے۔ تو اگر کوئی شخص ایک رکعت پالے تو اس پر بدرجۂ اولیٰ کل نماز فرض ہوجائے گی۔

۴۔ من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے جمعہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسے جمعہ کی ایک رکعت مل گئی تو اس پر جمعہ کی نماز کا اتمام ہی واجب ہے یعنی دوسری رکعت پڑھ لے اور ظہر نہ پڑھے اور جسے ایک رکعت بھی نہ ملی تو اس پر ظہر واجب ہوگی۔

امام مالکؒ نے خود موطا امام مالک ص:۷۸ پر حدیث ذکر کی ہے جس میں صلوٰتِ جمعہ کی صراحت ہے۔

(محل امتحان نمبر:۱۲) باب ماجاء في دُلوک الشمس وغسق اللّيل

عن مالک عن نافع: ان عبداللّٰه بن عمر کان یقول: دلوک الشمس؛ میلُها. مالک عن داوٗد بن حصین قال: أخبرني مخبر: ان عبداللّٰه بن عباس کان یقول: دُلوک الشمس إذا فاء الفئُ، وغسق اللیل إجتماع اللیل وظلمته.

تشریح:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''دلوک شمس'' سے آفتاب کا ڈھلنا مراد ہے۔

اور حضرت ابن عباس ''دلوک شمس'' کی تفسیر سایہ کے ڈھلنے سے فرماتے ہیں۔ اور ''غسق لیل'' سے رات کی تاریکی مراد لیتے ہیں۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

مقصدِ ترجمہ:

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَقِمِ الصلوٰۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ''''اس میں اوقاتِ صلوٰت کا بیان ہے، اس لیے امام مالکؒ نے اسے یہاں ذکر کیا ہے تاکہ صلوٰتِ خمسہ کے اوقات کی طرف اشارہ ہوجائے۔ اور اس سے امام مالکؒ کا مقصود حاصل ہو بھی رہا ہے اس طور پر کہ مکمل آیت یہ ہے: ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ'' لہٰذا دلوکِ شمس سے ظہر اور عصر کی طرف اشارہ ہوا اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء کی طرف، چونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے غسق اللیل کی تفسیر منقول ہے ''فقال: ھو غروب الشمس'' اور ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ''ھو العشاء الأخیر'' پس دونوں حضرات کی تفسیر جمع کرلی گئی اور ابوہریرہؓ کی تفسیر کے مطابق مغرب اور ابن مسعودؓ کی تفسیر کے مطابق عشاء مراد ہوگی۔ اور ''قُرْاٰنَ الْفَجْرِ'' سے فجر مراد ہے۔

(محل امتحان نمبر: ۱۳) جامع الوقت

عن مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: الذي تفوتہٗ صلوٰۃ العصر کأنما وترمالہٗ وأھلہٗ.

(مؤطا امام مالک: ص:۴، مؤطا امام محمد: ص:۱۲۷، باب الذي تفوتہٗ العصر)

حضرت ابن عمر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل فرماتے ہیں: جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا کہ اس کا گھر اور مال ودولت سب لٹ گیا۔

اس حدیث پاک میں عصر کی نماز کی اہمیت بتلانا مقصود ہے۔ جناب رسولِ خدا محمد صلی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان اپنے مال ودولت اور اہل وعیال کے ضیاع سے خوف کھاتا ہے اگر کسی کی عصر فوت ہوجائے تو اس کا حال بھی اس شخص سے کم نہیں جس کے مال اور اہل سب لُوٹ لیے گئے ہوں؛ لہٰذا عصر کی نماز کی پابندی کرنی چاہیے۔

وتر: چھین لینا؛ لہٰذا اهلهٗ ومالهٗ مرفوع ہوں گے۔ دوسرا معنیٰ ''کمی کرنا'' ہے اس صورت میں اهلهٗ ومالهٗ منصوب ہوں گے۔

من فاتهٗ صلوٰة العصر:

یعنی سورج ڈھل جائے یا وقتِ مکروہ آجائے اور اب تک عصر کی نماز ادا نہ کی جائے۔ مہلب شارح بخاریؒ فرماتے ہیں کہ تفوتهٗ سے فوت ہونا مراد ہے یعنی جس کی نماز فوت ہوجائے؛ کیونکہ سورج کے ڈھل جانے یا وقت مکروہ کے آجانے کے بعد عموماً نماز فوت ہوجاتی ہے اور یہی دونوں وجہیں فوت کا ذریعہ بنتی ہیں اس لیے انہوں نے فوت کو اپنے معنیٰ پر باقی رکھا۔

اشکال: فوت کہتے ہیں جس کے اندر عمد کا دخل نہیں ہوتا ہے، اس لحاظ سے وعید کا مستحق نہیں ہونا چاہیے، بلکہ عتاب ووعید تو تفویت (جان بوجھ کر چھوڑنے) پر ہوتا ہے۔

جواب: مطلقاً فوت پر وعید نہیں بلکہ حقیقۃً تو تفویت ہی پر عتاب ہے مگر یہاں فوت پر عتاب نازل ہونا اس کی صورت یہ ہے کہ انسان سے نماز فوت ہوگئی اور تکاسلاً اس کو وقت کے رہنے کے باوجود ادا نہ کیا؛ لہٰذا اس صورت میں اس کو وعید سنائی گئی ہے۔

اشکال: ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعید صرف صلوٰۃ عصر کے ساتھ خاص ہے، تخصیص کی وجہ کیا ہے؟

جواب: یہاں کوئی ایسی ترکیب نہیں جس سے وعید کے مختص بالعصر کا اشکال ہوسکے۔ اب رہی بات کہ عصر ہی کو کیوں خاص کر کے ذکر کیا، جبکہ یہ حکم عام ہے۔ تو اس

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

کی وجہ یہ ہے کہ اکثر عصر کی ہی نماز فوت ہوتی ہے؛ کیونکہ اس وقت مشاغل زیادہ رہتے ہیں، اس میں اُلجھ کر نماز فوت ہوجاتی ہے، ورنہ یہ حکم عام ہے ہر ایک نماز کا یہی حکم ہے۔ نیز عصر کو ذکر کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے فضائل بہت وارد ہوئے ہیں۔ سو اگر چہ یہ حکم عام ہے مگر عصر میں اس میں مزید قوت پیدا ہوجاتی ہے، پس جس کی دیگر نماز فوت ہوگئی اس کو تو عتاب ہے ہی اور جس کی عصر فوت ہوگئی اس سے بُرا حال کسی اور کا نہیں۔

عن مالک عن يحيٰی بن سعيد أن عمر بن الخطاب انصرف من صلوٰة العصر، فلقي رجلاً لم يشهد العصر، فقال: ماحبسک عن صلوٰة العصر؟ فذكر له الرجل عذراً فقال له عمر: طفَّفْتَ.

قال مالک: ويقال لكل شئ وفاء وتطفيفٌ. (مؤطا امام مالک: ص:۲)

ترجمہ: حضرت یحیٰی بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت فاروقِ اعظمؓ عصر پڑھ کر واپس لوٹ رہے تھے، ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوگئی جس نے جماعت سے عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے نماز مع الجماعت نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے عذر بیان کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ تم نے اپنے اجر کو کم کرلیا۔ یعنی جماعت سے نماز نہ پڑھنے پر تم کو کم ثواب ملے گا۔ قوله طففت أی أنقصت أجرک بالتاخير عن الجماعة.

قال مالک: ويقال لكل شئ وفاء وتطفيف. حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: ہر چیز کے اندر کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔ ''وفاء'' بڑھاو، کمالِ زیادتی ''تطفیف'' کمی، نقص۔

مالک عن يحيٰی بن سعيد أنه كان يقول: إن المصلي ليصلي الصلوٰة ومافاتهٗ وقتها، ولما فاتهٗ من وقتها اعظم وأفضل من أهله وماله.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

ترجمہ: حضرت یحییٰ فرماتے ہیں کہ نمازی نماز پڑھتا ہے اور وقت اسے فوت نہیں کرتا ہے؛ کیونکہ اس نے تو وقت کے اندر ہی نماز ادا کرلی، مگر جس کا وقت مستحب فوت ہوگیا (وہ تو بڑا ہی بدنصیب ہے؛ کیونکہ وقت مستحب اس کے لیے) اس کے مال اور گھر سے بہتر ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کہنا چاہتے ہیں جس شخص نے عند اصفرار الشّمس عصر کی نماز پڑھی اس نے وقت ہی کے اندر پڑھی مگر جب وقت مستحب نکل گیا اور وقت مکروہ آگیا تو وہ بھی وعید کے اندر آگیا۔ حضرت امام مالکؒ نے اپنے استاذ یحییٰ بن سعیدؒ کا یہ قول نقل کرکے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور حضرت یحییٰ کا یہ قول حکماً حدیث مرفوع ہے؛ کیونکہ اجر وثواب کا حکم اپنی رائے سے نہیں بیان کیا جاسکتا۔ معلوم ہوا کہ یہ قول حکماً حدیث مرفوع ہے۔ کما قالہٗ العلامۃ ابن البر۔

قال مالک: من أدرکه الوقت وهو في سفر فأخر الصلوٰة ناسيًا أو ساهيًا حتى قدم على أهله الخ.

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حالتِ سفر میں ہو اور نماز کا وقت آجائے اور وہ ناسیاً یا ساہیاً نماز کو مؤخر کردے یہاں تک کہ ابھی وقت باقی تھا کہ وہ گھر پہنچ گیا تو وہ بغیر قصر کیے ہوئے (مقیم کی نماز) ادا کرے اور اگر خروج وقت کے بعد گھر لوٹ رہا ہے تو اس پر قضاء لازم ہے، چونکہ اس پر نماز بالقصر فرض ہوئی تھی (کیونکہ فرضیت کے وقت وہ مسافر تھا اور مسافر پر قصر ہے) اس لیے سفر کی نماز قضاء کرے؛ (یعنی اگر ظہر، عصر یا عشاء فوت ہوتی ہے تو قصر کرے گا) کیونکہ جیسی نماز فرض ہوئی اسی کی قضاء لازم ہوگی۔ احناف کا بھی یہی مذہب ہے۔

عن مالک عن نافع أن ابن عمر اغمى عليه فذهب عقلهٗ فلم يقض الصلوٰة.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

حضرت امام مالکؒ نافعؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ کو بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اوران کی عقل جاتی رہی، جب افاقہ ہوا تو آپ نے فائتہ نماز کی قضاء نہیں فرمائی۔ (مؤطا امام مالک:ص:۵،مؤطا امام محمد:ص:۱۵۴)

اختلاف الائمة في المغمى عليه:

حضرت الامام الاعظمؒ فرماتے ہیں کہ اگر مدہوشی ایک دن اور ایک رات سے زائد ہوجائے تو اس کے ذمہ قضاء صلوٰۃ نہیں۔ اور اگر ایک دن اور رات سے تجاوز نہ کرے بلکہ کم یا برابر ہو تو اس کے ذمہ قضاء لازم ہے۔ (کمافی أوجز المسالک:ج:۱،ص:۲۴)

اور حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ خواہ کتنی ہی نماز فوت کیوں نہ ہوئی ہوں سب کی قضاء لازم ہے، وإن كان الف صلوٰةٍ.

امام مالکؒ اور شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر اغماء وقت صلوٰۃ کا استیعاب کرلے تو قضاء نہیں ہے جیسا کہ خود امام مالکؒ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے، فرماتے ہیں: "وذٰلک فیما نری والله أعلم ان الوقت ذهب فاما من أفاق وهو في وقت فإنه يصلي". یعنی حضرت ابن عمرؓ نے نماز کی قضاء اس لیے نہیں فرمائی کہ وقت ختم ہوچکا تھا اور وقتِ صلوٰۃ کے خروج کے بعد مغمی علیہ پر (ان کے یہاں) قضاء نہیں۔

دلائل:

حدیثِ باب یعنی حضرت ابن عمرؓ کے واقعہ ہی سے حنفیہ نے بھی اور مالکیہ نے بھی استدلال کیا ہے۔

امام مالکؒ کا استدلال اس طور پر ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو جو بے ہوشی طاری ہوئی وہ وقتِ صلوٰۃ کو مستوعب تھی، اس لیے انہوں نے قضاء نہیں کی اور احناف کے استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو اغماء ایک دن اور ایک رات تک لاحق رہا۔ اس کی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

تائید حضرت ابن عمرؓ ہی کے قول سے ہو رہی ہے کہ اگر اغماء ایک دن اور رات سے تجاوز نہ کرے تو اس پر قضاء لازم ہے۔ پس اگر فعل ابن عمرؓ کو اس مدت سے کم یا برابر پر محمول کیا جائے تو ان کے قول سے فعل کا تعارض لازم آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمدؒ نے مؤطا میں اِس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: ” و بهذا نأخذ إذا اغمى عليه أكثر من يوم وليلة وأما إذا اغمى عليه يومًا وليلةً أوأقل قضى صلوٰة“ اور اپنے قول کی تائید میں حضرت عمار بن یاسرؓ کا واقعہ ذکر کرتے ہیں: بلغنا عن عمار بن ياسر انهٗ أغمي عليه أربع صلوٰتٍ، ثم أفاق قضاها.

(مؤطا امام محمد: ص:۱۵۵)

(محل امتحان نمبر:۱۴) النوم عن الصلوٰة

مالک عن ابن شهاب عن سعيد بن المسيب أن رسول الله صلى الله عليه وسلم حين قفل من خيبر أسرٰى الخ.

(مؤطا امام مالک: ص:۵، مؤطا امام محمد: ص:۱۲۶)

حاصل حدیث یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ جب جنگِ خیبر سے لوٹ رہے تھے تو رات میں بھی سفر کو منقطع نہیں فرمایا؛ بلکہ چلتے رہے حتیٰ کہ جب اخیر رات ہوئی تو آپ ﷺ نے پڑاؤ ڈالا۔ اور حضرت بلالؓ کو حکم فرمایا کہ آپ بیدار رہیں، ہم اور اصحاب سو جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام سو گئے اور حضرت بلالؓ جاگتے رہے۔ مگر اللہ پاک کو رسولِ خدا کے عمل سے قضاء صلوٰۃ کی تعلیم دینا مقصود تھا، اس لیے حضرت بلالؓ کو بھی سلا دیا۔

اب نماز کا وقت بھی ہو چکا ہے نہ تو آپ ﷺ اور صحابہؓ کی آنکھ کھلی اور نہ ہی حضرت بلالؓ بیدار ہو سکے۔ نماز کا وقت بھی ختم ہو گیا حتیٰ کہ جب دھوپ کی تپش آپ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

ﷺ پر پڑی تب آپ ﷺ گھبرا کر اُٹھے اور حضرت بلال ؓ سے کہا کہ ہم نے تو تمہیں بیدار رہنے کی تاکید کی تھی، پھر بھی سو گئے۔ حضرت بلال ؓ نے نہایت ہی ادب کے ساتھ معذرت پیش کر دی کہ نیند پر کسی کو قابو اور کنٹرول نہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں سے چلو؛ کیونکہ یہ شیطان کی وادی ہے۔ صحابہ کرام ؓ نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کجاوا کس لیا اور سفر شروع کر دیا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد حضرت بلال ؓ کو تکبیر کہنے کا حکم فرمایا، آپ نے نماز پڑھائی۔ اور فرمایا: اگر کوئی شخص نماز پڑھنا بھول جائے تو جب اسے یاد آ جائے پڑھ لے؛ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب نماز یاد آئے تو پڑھ لو۔ (اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ) ''أي لذکر صلوتي''.

یہاں دو مسئلے ذکر کیے جائیں گے:

(۱)۔ اوقاتِ مکروہہ میں قضاء صلوٰۃ جائز ہے یا نہیں؟

(۲)۔ قضاء نماز کے لیے اذان وتکبیر ہے یا نہیں؟

مسائل ذکر کرنے سے پہلے حدیث پر جو اشکال ہو سکتا ہے اس کا اندفاع کیا جاتا ہے۔

اشکال: اس روایت پر یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ سے غفلت کا صدور ہوا، یعنی آپ ﷺ نے غفلت سے فجر کی نماز بروقت اداء نہیں فرمائی۔ حالانکہ یہ شانِ نبوت کے خلاف ہے۔

جواب: یہ ہے کہ قضاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غفلت کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ من جانب اللہ تکوینی طور پر یہ واقعہ پیش آیا، تاکہ عمل نبی سے امت قضاء صلوٰۃ کا مسئلہ سیکھے۔

ایک اور اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن عائشة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: تنامُ عيني والقلب يقظان.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

"آپ علیہ وسلم صلی اللہ فرماتے ہیں کہ اگر میں سو بھی جاتا ہوں؛ لیکن میرا دل جاگتا رہتا ہے"
اب اشکال یہ ہے کہ جب آپ کا دل جاگ رہا تھا تو پھر آپ سے ذہول عن الوقت کیوں ہوا؟

جواب: یہ ہے کہ طلوعِ شمس از قبیل حسیات ہے اور قلب کا تعلق حسیات سے نہیں ہوتا؛ لہٰذا حسی شئ کا قلب نے ادراک نہیں کیا۔ اور جو مدرک ہے وہ تو حالتِ منام میں ہے یعنی آنکھ تو سورہی تھی پھر ادراک کیسے کرسکتی ہے؟

(محل امتحان نمبر:۱۵) قضاء الصلوۃ في الأوقات المكروهة

ائمہ ثلاثہ متفق ہیں کہ فائتہ نماز جس وقت بھی یاد آجائے فوراً اس کی قضاء لازم ہے، خواہ وہ وقت تذکر، اوقاتِ مکروہہ میں سے ہو۔ لہٰذا عند طلوع الشمس و عند الغروب والاستواء سب وقتوں میں قضاء جائز ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اوقاتِ مکروہہ میں قضاء جائز نہیں ہے۔

دلائل:

جمہور اپنے مذہب کی تائید میں حدیثِ باب کو پیش کرتے ہیں۔ وفیہ: قال حين قضى الصلوٰة: من نسي الصلوٰة فليصلها إذا ذكرها. آپ نے عندالتذکر نماز کی قضاء کا حکم فرمایا ہے اور وقت کی نہ تو تخصیص فرمائی اور نہ ہی آپ نے کسی وقت کا استثناء فرمایا۔

احناف کہتے ہیں کہ قضاء کا وجوب موسع ہے جیسا کہ ابن ارسلان نے فرمایا ہے:
أن الظروف يقدر متسعًا والّا يلزم الاتيان بجميع الصلوٰة في وقت التذكر وهي اللحظة اليسرة. وهي بديه الفساد. اور جب وجوبِ قضاء کے

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اندر وسعت ہے تو یاد آنے اور جاگنے کے بعد کسی بھی وقت میں نماز (قضاء) پڑھی جاسکتی ہے، لہٰذا اگر نماز یاد آگئی اور وہ وقت ایسا ہے کہ نماز پڑھنے کی اس میں اجازت ہے تو فوراً پڑھی جاسکتی ہے اور وقت ممنوع میں نماز یاد آئی تو نماز پڑھنا جائز نہیں، لہٰذا حنفیہ کا استدلال ان تمام احادیث سے ہے جن میں اوقاتِ ثلاثہ (طلوعِ شمس، غروب اور استواء) میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔

مذہبِ احناف کی وجہ ترجیح:

(۱)۔ جمہور کا، دلیل مذکور سے استدلال تام نہیں ہوتا ہے؛ کیونکہ وہ حدیث احناف کے خلاف نہیں پڑتی بلکہ خود ان ہی کے خلاف حجت ہے۔ اور وہ اِس طور پر کہ حدیث مذکور میں یہ جملہ آیا ہے: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: اقتادوا. فبعور راحلهم واقتادوا شيئًا. یعنی آپ ﷺ نے اس جگہ سے کوچ کرنے کا حکم فرمایا اور صحابہؓ وہاں سے ہٹ گیے الخ۔ پس اگر عند التذکر علی الفور قضاء لازم ہوتی تو یقیناً آپ ﷺ اسی وقت وہیں نماز پڑھ لیتے، مگر آپ نے وقت مکروہ ہونے کی وجہ سے وہاں اسی وقت نماز نہیں پڑھائی۔

اس کا جمہور کی طرف سے جواب دیا گیا ہے کہ آپ کے کوچ کرنے کی وجہ (طلوعِ شمس) وقت مکروہ کا ہونا نہیں تھی۔ بلکہ آپ نے خود اس کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ: ان هٰذا وادٍ به شيطان. یعنی سبب خروج، وجود شیطان في ذٰلک المکان ہے۔

(۱) ہم اس کا جواب دیں گے کہ وجودِ شیطان مانع شرعی نہیں ہے، جس کی وجہ سے نماز مؤخر کردی جائے، بلکہ آپ کے ارشاد: ''ان هٰذا وادٍ به شيطان'' سے اشارہ ہے وقتِ مکروہ کی طرف۔ وہ اِس طور پر کہ آپ نے فرمایا: ان الشمس تطلع ومعها قرن الشيطان الخ. یعنی طلوعِ شمس قرنِ شیطان کے بیچ میں ہوتا ہے اور

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جہاں ''قرن شیطان'' ہو وہاں شیطان بھی ہوگا۔اسی لیے آپ ﷺ نے وقتِ مکروہ (طلوعِ شمس) کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ''ان ھٰذا وادٍ به شیطان'' فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جمہور کا جواب دینا غیر مناسب ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ وقتِ مکروہ کی صراحت بھی ابوداؤد اور مسلم کی روایت سے معلوم ہوتی ہے: وفيه أخّر حتّٰى إذا ارتفعت الشمس یعنی آپ نے بیدار ہونے کے بعد سے ارتفاع شمس (خروجِ وقت مکروہ) تک نماز کو مؤخر فرمایا۔

۲۔ وجوبِ قضاء میں وسعت ہوتی ہے۔کمامر

۳۔ دلیل جمہور سے اِباحت ثابت ہوتی ہے اور دلیلِ احناف سے حرمت اور عندالتعارض حرمت کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ دلیل جمہور بیانِ وقت میں ظاہر ہے، اگر چہ اداءِ صلوٰۃ کے بیان میں نص ہے۔اور دلیل احناف بیان وقت میں نص ہے۔اور نص کو ظاہر پر تقدم حاصل ہے۔

(کما فی الکوکب الدری:ج:۱،ص:۱۰۰)

الأذان والإقامة للفوائت:

حضرت امام مالکؒ کے یہاں فائتہ کی قضاء کے لیے صرف اقامت ہے اذان نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اذان و اقامت دونوں ہیں۔حضرت امام شافعیؒ کا مشہور قول یہی ہے۔

امام مالکؒ: حدیث الباب سے استدلال فرماتے ہیں: 'فيه: فأمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بلالًا، فأقام الصلوٰة فصلّٰى الخ''. یعنی آپ نے حضرت بلالؓ کو تکبیر کہنے کا حکم فرمایا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جمہور: اور جمہور کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام ابوداؤدؒ نے ذکر فرمایا ہے:

فأمر بلالًا فأذّن واقام وصلّٰی.

وأن النبي صلی اللہ علیه وسلم أمر بلالًا بالأذان والإقامة.

ان روایات میں اذان واقامت کی صراحت ہے۔لہٰذا دونوں کی اجازت ہوگی۔

نیز قیاس سے بھی جمہور کی تائید ہوتی ہے کہ اذان واقامت کا تعلق وقت سے نہیں ہے، بلکہ نماز سے ہے، لہٰذا جب نماز پڑھنا چاہے اذان واقامت ہونی چاہیے اگرچہ وقت فوت ہوچکا ہے۔

جواب:

امام مالکؒ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ اصل تو یہی ہے کہ اذان واقامت دونوں ہوں جیسا کہ عقل بھی اسے تسلیم کرتی ہے۔اب رہی بات کہ حدیث میں تو صرف اقامت کا تذکرہ ہے۔جواب یہ ہے کہ حدیثِ پاک میں اذان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ورنہ حقیقۃً حضرت بلالؓ نے اذان بھی کہی اور اقامت بھی کما ثبت بما رواہ ابو داؤد. لہٰذا حدیث باب مؤول ہے اور عبارت مقدر ہے: ''اقام الصلوٰۃ بعد الأذان'' کیوں کہ عدمِ ذکر وجود کے منافی نہیں، یا یہ کہا جائے کہ اگر کسی نے صرف اقامت ہی کہہ لی اور آذان نہ کہی تو بھی جائز ہے۔گویا کہ حدیثِ باب بیانِ جواز پر محمول ہے۔

(محل امتحان نمبر:۱۶) النهی عن الصلٰوۃ بالهاجرۃ

عن مالک عن زيد بن أسلم عن عطاء بن يسار ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: إن شدّة الحرّ من فَيْحِ جهنم. فإذا اشتد الحرُّ فأبردوا عن الصلٰوۃ.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

وقال: إشتكت النار إلى ربها، فقالت: يا رب! أكل بعضي بعضًا، فأذِنَ لها بنفسين في كل عام؛ نفس في الصيف ونفس في الشتاء.

حدیثِ پاک میں رسول اللہ ﷺ نے گرمی کی شدت کو "فیح جهنم" جہنم کی بھاپ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شدتِ حرجہنم کا اثر ہے۔ اسی طرح سردی کی شدت بھی جہنم کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: إشتكت النار إلى ربها الخ. یعنی جہنم نے بارگاہِ ایزدی میں فریاد کی کہ اے رب تعالیٰ: آگ کے کثرت اجزاء ہونے کی وجہ سے اور آپس میں تمام اجزاء کے گڈمڈ ہونے کی وجہ سے ہمارا حال یہ ہے گویا کہ بعض اجزاء نار بعض کو کھانے، فنا کرنے اور نگل جانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، یعنی آگ کے اندر جوش حرارت بہت زیادہ ہوگئے ہیں جس سے ہمارا حال بدتر ہے۔ حق تبارک وتعالیٰ نے فریاد سن لینے کے بعد دو سانس لینے کی اجازت دی، ایک سانس گرمی میں لینے کی، اور دوسری موسمِ شتاء میں۔ معلوم ہوا کہ شدت برودت اور شدت حر، جہنم کی بھاپ کا اثر ہے، لہٰذا جب سخت گرمی پڑے تو ظہر کی نماز تاخیر سے پڑھو تاکہ دھوپ اور گرمی کی شدت سے (جو کہ دراصل دوزخ کی بھاپ ہے) نجات ہو۔ اور نماز کی روح یعنی خشوع وخضوع حاصل ہو۔

اشکال:

یہاں ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ گرمی وسردی، شدت حرارت اور شدت برودت کا تعلق تو نظام شمس سے ہے جہاں کرۂ ارض سے سورج جتنا قریب ہوتا ہے اتنی ہی شدت حرارت میں اضافہ ہوتا ہے اور دُوری کی وجہ سے سردی میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ گرمی وسردی کی شدت میں جہنم کا اثر ہے خلافِ بداہت ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جواب:

نظامِ شمس سے گرمی وسردی کا تعلق ظاہراً ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ یہ سب کچھ جہنم کی وجہ سے ہے؛ کیونکہ یہ خبر، صادق ومصدوق، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی پہنچی ہے، جس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، قرآن کہتا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. حضور پاک ﷺ کا ہر ارشاد وحی ربانی ہے۔

اشکال:

مگر ایک اشکال اور باقی رہ جاتا ہے کہ جہنم سے گرم سانس کا نکلنا تو عقل سے لگتی ہوئی بات ہے مگر ٹھنڈی سانس کا جہنم سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

جواب:

یہ ہے کہ مسلم شریف کی روایت ہے: فما ترون من شدة البرد فذلک من زمهريرها الخ. حاصل یہ ہے کہ جہنم کے طبقات مختلف ہیں: ایک طبقہ شدتِ برودت کا بھی ہے جس کا نام "زمہریر" ہے، ٹھنڈی سانس کا تعلق اسی طبقہ سے ہے۔

(محل امتحان نمبر:۱۷) ألنهي عن دخول المسجد بريح الثوم وتغطية الفم في الصلوٰة

عن مالک عن ابن شهاب عن سعيد بن المسيب أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من أكل من هٰذه الشجرة فلا يقرب مساجدنا، يوذينا بريح الثوم.

حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لہسن اور ہر بدبودار اشیاء کھاکر مسجد وغیرہ میں آنے سے منع فرمایا ہے: **چنانچہ فرماتے ہیں:** جو بھی اس درخت

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(لہسن) میں سے کھائے وہ ہماری مسجدوں کے قریب بھی نہ آئے، کیونکہ ان کے آنے سے ہمیں لہسن کی بُو کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔

من أكل من هٰذه الشجرة.

شجرہ سے لہسن پیاز اور بد بُودار اشیاء مراد ہیں۔ اور ان کو ''شجرہ'' مجازاً کہا گیا ہے علاقۂ مجاز مسلم و بخاری کی روایت ہے جس میں ''البصل والثوم'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اور مطلقاً بصل (پیاز) اور لہسن سے ممانعت نہیں بلکہ ممانعت کچے لہسن و پیاز سے ہے؛ کیونکہ ان میں بُو ہوتی ہے۔ لہٰذا مطبوخہ پیاز اور لہسن بلا کراہت جائز ہے۔ ويؤيده ما في الترمذي وأبي داؤد: عن علي مرفوعًا قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أكل الثوم إلا مطبوخًا. معلوم ہوا کہ ممانعت کی علت عام ہے، لہٰذا اگر کسی نے لہسن اور پیاز وغیرہ کھا رکھی ہے تو اس کا مسجد میں جانا منع ہے، خواہ کوئی بھی مسجد ہو بعض حضرات نے ممانعت کو مسجد نبوی کے ساتھ خاص کیا ہے مگر یہ تخصیص صحیح نہیں؛ لعموم العلة، وهي الأذى. یہی وجہ ہے کہ علماء نے عموم علت کی وجہ سے ہر بد بودار اشیاء کو ہر عظیم جگہ محفل قرأت، مجلس وعظ وغیرہ میں جانے کو بھی حکم کے تحت داخل کیا ہے۔ (كما قاله العيني والشامي)

عن مالك عن عبد الرحمٰن بن المجبَّر، أنهٗ يرى سالم بن عبد الله إذا رأى الناس يغطي فاهٗ وهو في الصلوٰة جذب الثوب جذبًا شديدًا ينزعهٗ عن فيه. (مؤطا امام مالک: ص:٦)

حضرت سالم بن عبداللہ جب کسی شخص کو حالتِ صلوٰۃ میں منہ ڈھانپتے دیکھتے تو خوب زور سے کپڑا کھینچ لیتے یہاں تک کہ اس کا منہ بالکل ہی کھل جاتا تھا۔

تغطي في الصلوٰة:

نماز میں منہ ڈھانپنا مکروہِ تحریمی ہے کما نقله الطحاوي عن أبي السعود.

(أوجز المسالك: ص:٣٤)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

منہ ڈھانپنے سے تکبّر پیدا ہوتا ہے جو مقصودِ صلوٰۃ یعنی خشوع وخضوع کے منافی ہے اسی وجہ سے منع کیا گیا ہے کما قالہٗ العلامۃ الباجي.

اور ابن عابدین ''علّامہ شامیؒ'' فرماتے ہیں کہ مجوسی آگ کی پوجا کرتے وقت اپنی ناک اور منہ کو بند کر لیتے تھے، لہٰذا اگر کوئی حالتِ صلوٰۃ میں منہ ڈھانپے گا تو مجوسی سے مشابہت لازم آئے گی اور اس سے منع کیا گیا ہے قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم.

کتاب الطهارة

(مؤطا امام مالک: ص:٦، موطا امام محمد: ص:٤٦)

بیان اوقاتِ صلوٰۃ سے فراغت کے بعد کتاب الطہارۃ کو مصنفؒ نے بیان کیا ہے۔

امام مالکؒ نے وضوء کا بیان کرتے ہوئے ''العمل في الوضوء'' اور امام محمدؒ نے ''ابتداء الوضوء'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ اوقات کے بیان کے بعد وضوء کے بیان کی وجہ یہ ہے کہ وقت کے بعد وضوء کا خطاب آتا ہے لہٰذا جس کو حق تقدم حاصل ہے اسے مقدم کیا۔

(محل امتحان نمبر:۱۸) العمل في الوضوء

مالک عن عمرو بن يحيٰى المازني الخ. فدعا بوضوءٍ فأفرغ علٰى يده، فغسل يديه مرتين، ثم مضمض واستنثر ثلاثًا ثم غسل وجهه ثلاثًا الخ.

حدیثِ پاک میں حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم طریقۂ وضو بیان فرما رہے ہیں اور طریقۂ بیان قول نہیں بلکہ فعل ہے، تاکہ اوقع فی النفس ہو۔ چنانچہ انہوں نے وضوء کر کے بتلایا کہ رسولِ خدا علیہ وسلم ایسا ہی وضو فرماتے تھے۔

فأفرغ علٰى يده: آپؐ نے دونوں ہاتھوں پر اوّلاً پانی بہایا پھر دونوں کا غسل فرمایا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

ثم مضمض واستنثر ثلاثًا: پھر کلی فرمائی اور ناک میں پانی ڈالا تین مرتبہ۔
ثلاثًا کا تعلق مضمضہ اور استنثار دونوں سے ہے۔ مضمضہ کا معنی ہے: ''منہ میں پانی ڈال کر حرکت دینا'' اور استنشاق کا معنی ہے: ''اخراج الماء من الأنف'' یعنی ناک سے پانی نکالنا اور اخراج کے لیے اوّلاً دخول لازم ہے اس لیے اب یہ معنی ہوگا ''ناک میں ڈالنا پھر نکالنا'' اسی وجہ سے بعض حضرات کا خیال ہے استنشاق (جس کا معنی ''إدخال الماء من الأنف'' ہے) اور استنثار دونوں ایک ہیں۔

اختلاف الائمة في المضمضة والإستنشاق:

مضمضہ اور استنشاق کی حیثیت اور کیفیت دونوں میں حضرات ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ گویا کہ یہاں دو مسئلے ذکر کیے جائیں گے:

(۱)۔ مضمضہ اور استنشاق کی حیثیت (وجوب وسنیت) میں اختلافِ ائمہ۔

(۲)۔ کیفیت (یعنی من کف واحد یا من کف ثلاثًا ثلاثًا) وغیرہ میں اختلاف۔

مضمضہ اور استنشاق کی حیثیت:

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں وضوء اور غسل میں واجب ہیں: وإليه ذهب الإمام اسحق وابن المبارك وابن أبي ليلى.

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وضوء اور غسل دونوں میں ان دونوں کی سنیت کے قائل ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: وضوء میں دونوں مسنون ہیں اور غسل میں واجب ہیں۔

دلائل:

امام احمدؒ، ترمذی کی ایک روایت سے (جس میں بہ صیغۂ امر حکم وارد ہے) استدلال فرماتے ہیں: عن أبي هريرة: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا توضأت فاستنثر.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

وفي رواية: إذا توضأت فليستنثر.

وعن بن صبرة: إذا توضأت فمضمض. (رواه ابوداؤد)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ وضوء میں مضمضہ اور استنشاق واجب ہے اور جب حدثِ اصغر (وضوء) میں یہ واجب ہیں تو حدثِ اکبر (غسل) میں بدرجۂ اولیٰ واجب ہوں گے۔

جواب:

صیغۂ امر سے وجوب پر استدلال تام نہیں؛ کیونکہ مطلقاً امر وجوب کے لیے نہیں ہے، بلکہ اگر وجوب کے علاوہ کوئی قرینہ نہ ہو تو وجوب پر محمول کیا جاتا ہے، اور یہاں وجوب کے علاوہ سنیت کا قرینہ موجود ہے اور وہ آیتِ وضوء ہے: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ الخ. یہاں مضمضہ وغیرہ کا بیان نہیں جبکہ یہ مقام بیان ہے۔ نیز وہ تمام احادیث دلیل ہیں جن سے سنیت ثابت ہوتی ہے۔ فلا يقال بوجوبهما.

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا استدلال ابوداؤد (ج:۱،ص:۸) کی روایت سے ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے (باب السواک) عشر من الفطرة الخ. وفي رواية عنها: عشر من سنن المرسلين الخ.

حضرت عمار بن یاسرؓ کی روایت ہے: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان من الفطرة المضمضة والإستنشاق. (ابوداؤد: ج:۱، ص:۸)

جواب:

آپ کے استدلال سے صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ وضوء میں یہ دونوں مسنون ہیں۔ اور غسل میں مسنون ہونا ثابت نہیں ہوتا اور ہم بھی وضوء میں اس کی سنیت کے قائل ہیں۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

نیز آیتِ وضوء میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا وہ روایت جو بہ صیغۂ امر ہے استحباب پر محمول ہوگی۔

احناف کا استدلال:

وضوء میں سنیت پر ہمارا استدلال ان ہی روایات سے ہے جو امام مالکؒ و شافعیؒ کا متدل ہیں۔ اور وجوب فی الغسل پر ہماری دلیل آیتِ قرآنی ہے: قولہ تعالیٰ: وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا. اللہ پاک نے تحصیل طہارت کے لیے مبالغہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور مبالغہ کے اندر زیادتی مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ وضوء اور غسل کے طریقۂ تطہیر میں فرق ہے۔ وضوء میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا واجب نہیں اور غسل میں واجب ہے، اگر زیادتی ہوسکتی ہے تو صرف ان ہی مقام میں ہوسکتی ہے ورنہ پورے بدن پر پانی بہائے بغیر تو غسل کا معنی مقصود نہیں ہوسکتا ہے، لہٰذا وہاں زیادتی کا سوال ہی نہیں۔ پس مضمضہ اور استنشاق کو واجب کر کے ہم نے زیادتی کی ہے، فثبت انهما من الواجبات في الغسل دون الوضوء.

مضمضہ اور استنشاق کی کیفیت:

مضمضہ اور استنشاق کی چھ صورتیں نکلتی ہیں:

(۱) غرفة واحدة بالوصل. (۲) غرفة واحدة بالفصل.

(۳) غرفتان بالفصل. (۴) ثلاث غرفات بالوصل.

(۵) ثلاث غرفات بالفصل. (۶) ستُّ غرفات بالفصل.

یہ تمام صورتیں اور طریقے جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کے نزدیک جائز ہیں۔ البتہ ائمہ اکرام کا اختلاف افضلیت کے اندر ہے۔

فقال الإمام الشافعي: الوصل أولى من الفصل بثلاث غرفات. وهو مروي عن احمد. وفي روايةٍ عن الإمام مالك.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

وقال الإمام الأعظم: الفصل أفضل من الوصل. یعنی فصل ہمارے نزدیک بہتر اور افضل ہے۔ (کما في البدائع: ج:۱، ص:۱۱۱، والتعلیق: ج:۱، ص:۲۰۵)

وبه قال: الإمام مالکؒ کما في روایة عنه۔

الدلائل:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم تمضمض واستنشق بكف واحد.

(رواه ابن ماجة في سننه کتاب الطهارة وسننها. باب: المضمضة والإستنشاق من كف واحد: ج:۱، ص:۱۴۲)

نیز بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم کی روایت ہے: فمضمض واستنشق من كفٍ واحد وفعل ذلك ثلاثًا. (البخاري: ج:۱، ص:۳۲)

دلائلِ احناف:

عن أبي وائل قال: شهدت علي بن أبي طالب وعثمان تَوَضَّأَ ثلاثًا. وأفردا المضمضة من الإستنشاق.

اس روایت میں مضمضہ اور استنشاق میں فصل کی صراحت موجود ہے، نیز امام ابوداؤد نے ''مصرف بن عمروؓ'' کی روایت نقل کی ہے: قال: دخلتُ یعني علی النبي صلی الله علیه وسلم وهو یتوضأ والماء یسیل من وجهه ولحیته علی صدره، فرأیت یفصل بین المضمضة والإستنشاق. (ابوداؤد: ج:۱، ص:۱۹)

ولأنهما عضوان منفردانِ فیفرد كل واحد منهما بماء علی حدةٍ كسائر الأعضاء. (بدائع الصنائع: ج:۱، ص:۱۱۱)

یعنی فم (منہ) اور انف (ناک) دونوں علیحدہ علیحدہ اجزاء ہیں۔ لہٰذا ہر عضو کو الگ الگ پانی سے بالفصل دھویا جائے گا جیسا کہ دیگر اعضاءِ وضو کو بالفصل دھویا جاتا ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

الجواب:

(۱)۔ مضمضہ، استنشاق کے بالوصل اور بالفصل ہر دو طریقے مشروع ہیں۔ لہٰذا ان کی روایت، بیان جواز پر محمول ہوگی۔ (کمافی المرقات: ج:۲، ص:۱۴) اور احناف کی دلیل افضلیت پر محمول ہوگی؛ کیونکہ اصل یہی ہے کہ ہر اعضاء کو الگ پانی سے صاف کیا جائے۔

(۲)۔ شوافع کے دلائل محتمل ہیں، یعنی جہاں اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ آپ نے من کف واحد بماء واحدٍ، مضمضہ اور استنشاق فرمایا۔ وہیں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ علیہ وسلم نے بالفصل بماء جدید، مضمضہ اور استنشاق فرمایا ہو۔

اور احناف کے دلائل صاف اور واضح ہیں کہ آپ نے دونوں کے درمیان فصل فرمایا۔ فلایکون حجة مع الإحتمال. أو يرد المحتمل إلى المحكم.

(کمافي البدائع: ج:۱، ص:۱۱۱)

(۳)۔ مضمض واستنشق بكف واحد. ''کف واحد'' میں تنازع فعلان ہے۔ ''مضمض اور استنشق'' دونوں عمل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اصل روایت اس طور پر ہوگی: مضمض بكف واحدٍ واستنشق بكف واحد.

(۴)۔ علامہ ابن الہمام نے فرمایا: حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی ہاتھ سے مضمضہ اور استنشاق کیے جائیں، یعنی غسل وجہ کی طرح دونوں ہاتھ لگانے کی حاجت نہیں۔ فمعنى الحديث مضمض واستنشق من كف واحد لا بكفين.

(محل امتحان نمبر:۱۹) ثم مسح رأسه بيديه الخ

(المقدار المفروض في مسح الرأس)

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک استیعاب رأس فرض ہے۔ وهو رواية عن الإمام احمد. وبه قال المزني.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ادنیٰ مایطلق علیه اسم المسح فرض ہے چنانچہ اگر ایک بال پر بھی مسح کرلیا تو جائز ہے۔

حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ مقدار ناصیہ فرض ہے۔ ففي الهداية: قال: والمفروض في مسح الرأس مقدار الناصية وهو ربع الرأس. (ہدایہ: ج:۱، ص:۱۷ وکذا في معارف السنن: ج:۱، ص:۱۷۳ وفي بداية المجتهد: ج:۱، ص:۱۲)

دلائل:

امام مالکؒ و احمدؒ کا استدلال: اللہ پاک کے ارشاد سے ہے: ''وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ'' خدا تعالیٰ نے مطلقاً رأس کو ذکر فرمایا ہے اور رأس کا اطلاق پورے سر پر ہوتا ہے، لہٰذا استیعاب ثابت ہوا۔

نیز حدیث باب سے بھی ان کا استدلال ہے: ''مسح رأسه بيديه فأقبل بهما وأدبر'' یعنی آپ ﷺ نے مسح رأس میں اقبال و ادبار فرمایا اس صورت میں پورے سر کا استیعاب ہوجاتا ہے۔

امام شافعیؒ: خدائے پاک نے آیتِ وضو میں مسح رأس کو مطلقاً ذکر فرمایا ہے اور اطلاق کی صورت میں ادنیٰ فرد پر عمل کر لینے سے بھی تعمیل حکم ہوجاتی ہے۔ نیز عرف میں بھی مسح بالشئ استیعاب کا متقاضی نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع: ج:۱، ص:۶۹)

احناف: (۱)۔ حضرت مغیرہ کی روایت سے استدلال فرماتے ہیں: أنه عليه السلام أتى سباطة قوم فبال وتوضأ ومسح على ناصيته وخفيه.

(ہدایہ: ج:۱، ص:۱۷)

(۲)۔ وعنه: أن النبي صلى الله عليه وسلم مسح على الخفين ومقدم رأسه. (مسلم شریف: ج:۱، ص:۱۳۴)

(۳)۔ قوله تعالى: ''وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ'' دخولِ باء میں اصل یہ ہے کہ وہ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

آلہ پر داخل ہو،لہٰذا جب آلہ پر باء داخل ہوگی تو بعض آلہ مراد ہوگا نہ کہ کل آلہ۔ اور جب باء محل پر داخل ہوگی تو اپنی خاصیت کے ساتھ داخل ہوگی یعنی محل کا بعض ہی مراد ہوگا نہ کہ کل۔ اور یہاں "باء" محل یعنی "رؤس" پر داخل ہے، لہٰذا رؤس کا بعض ہی مراد ہوگا۔ پس استیعاب فرض نہیں ہے۔

(۴) اب رہی بات یہ کہ وہ بعض جس پر مسح کیا جائے اس کی مقدار کیا ہوگی؟ اس سلسلہ میں آیت مجمل ہے اور اس مجمل کی تفصیلات صاحبِ شریعت کی طرف سے ہوگی اور صاحبِ شریعت جناب رسولِ خدا ﷺ نے اس کی تفصیل "مسح علی الناصیة" فرما کر بیان فرما دیا ہے۔ لہٰذا مقدارِ ناصیہ فرض ہے پس "ادنیٰ مایطلق علیه اسم المسح" کا قول صحیح نہیں ہوگا کما قال به الشافعي.

(بدائع الصنائع: ج:۱، ص:۷۱، هدایه: ج:۱، ص:۱۷)

جواب:

امام مالکؒ کا آیتِ قرآنی سے استدلال درست نہیں جیسا کہ ابھی دلیل احناف (۳) میں اس کی تفصیل گزری۔

اور حدیث الباب سنیت پر محمول ہے یعنی استیعاب رأس کی روایت سے سنیت ثابت ہوتی ہے۔

اور امام شافعیؒ کی دلیل کا بھی جواب، احناف کی دلیل (۴) سے واضح ہوجاتا ہے۔

وهو ان الآیة لیست بمطلقة بل مجملة و حدیث المغیرة بیان له.

(هدایه: ج:۱، ص:۱۷)

نیز اگر مطلقاً مسح رأس فرض ہوتا یعنی مقدارِ ناصیہ سے کم پر بھی مسح جائز ہوتا تو آپ پوری زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور ایسا کر کے دکھلا جاتے تاکہ علم ہوجائے کہ مقدارِ ناصیہ فرض نہیں۔ (کذافی التعلیق: ج:۱، ص:۲۰۶)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

یہی وجہ ہے کہ ملّا علی قاریؒ فرماتے ہیں: فحديث المغيرة حجة على المالكية والشافعية. (المرقاۃ: ج:۱، ص:۱۷)

(محل امتحان نمبر:۲۰) التثليث في مسح الرأس

تثلیث مسح میں ائمہ کا اختلاف ہے۔
امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تثلیث مسح رأس مسنون ہے۔ وهو رواية عن احمد.
امام اعظمؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا قول مشہور یہ ہے کہ مسح رأس صرف ایک مرتبہ مسنون ہے اور تثلیث مکروہ ہے۔ (کمافی البدائع الصنائع: ج:۱، ص:۱۱۴)

دلائل:

امام شافعیؒ کا استدلال: (۱)۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے ہے، فيه: قال: رأيت عثمان غسل ذراعيه ثلاثًا ثلاثًا. مسح رأسهٗ ثلاثًا ثم قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم توضأ هٰكذا. (ابوداؤد: ج:۱، ص:۱۵)
(۲)۔ رأس پر مسح ارکانِ وضوء میں سے ہے، جیسا کہ غسل وجہ، غسل یدین والرجلین ہے۔ لہٰذا چار اعضاء میں تین کا غسل، اور ایک کا مسح ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر اعضاء وضوء کا غسل تین مرتبہ مسنون ہے، لہٰذا مسح رأس میں بھی تثلیث مسنون ہوگی۔
امام اعظمؒ اور جمہور کا استدلال بخاری کی روایت سے ہے:
(۱)۔ سئل عبدالله بن زيد عن وضوء النبي صلى الله عليه وسلم الخ. وفيه: مسح برأسه مرةً. (بخاری شریف: ج:۱، ص:۳۲)
(۲)۔ ابوداؤد میں عبد خیر کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے وضو فرمایا فمسح برأسه مرةً واحدةً الخ. ثم قال: من سره أن يعلم وضوء رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو هٰذا. (ابوداؤد: ج:۱، ص:۱۵)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(٣)۔ أن أنسًا توضأ ثلاثًا و مسح برأسه مرة واحدة. (هدايه: ج:١، ص:٢١)

(٤)۔ المفروض هو المسح وبالتكرار يصير غسلًا فلايكون مسنونًا.

یعنی مسح، رأس کا حکم ہے اور مسح کہتے ہیں تر ہاتھ کے پھیرنے کو، پس اگر تین مرتبہ تر ہاتھ سر پر پھیرے گا تو غسل ہو جائے گا۔ (ہدایہ: ج:١، ص:٢٢)

جواب:

(١)۔ امام شافعیؒ نے جو حضرت عثمانؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے وہ درست نہیں، کیونکہ امام ابوداؤد نے اِس بات کی صراحت فرمائی کہ حضرت عثمانؓ سے جو صحیح احادیث منقول ہیں وہ یہ ہیں کہ انہوں نے صرف ایک مرتبہ مسح رأس فرمایا ہے: قال ابوداؤد: أحاديث عثمان الصحاح كلها تدل على أنه مسح الرأس مرة. (ابوداؤد: ج:١، ص:١٥)

(٢)۔ اگر تکرار مسح کو ثابت مان لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ ماءِ واحد سے انہوں نے تین مرتبہ مسح فرمایا۔ (ہدایہ: ج:١، ص:٢١)

وقال في البدائع: وذٰلک سنة عندنا في رواية الحسن عن أبي حنيفة. (البدائع: ج:١، ص:١١٥) یعنی تثلیث مسح بماءِ واحد لا بماءِ جدید مسنون ہے۔

(٣)۔ روایاتِ تثلیث شاذ ہیں، ثقات کی روایت کے خلاف ہیں فلایقبل. (المرقات: ج:٢، ص:١٥)

(٤)۔ امام شافعیؒ کا مسح رأس کو اعضائے مغسولہ پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق ہے اور قیاس مع الموافق ہونا چاہئے نہ کہ مع الفارق، لأن المقصود من الغسل التنظيف. والمقصود من المسح التخفيف. یعنی غسل کا مقصد تنظیف ہے اور مسح کا مقصد تخفیف ہے، اور تکرار مسح میں تخفیف نہیں۔

(٥)۔ مسح مراةً واحدةً پر نص وارد ہے فلايقاس عليه.

(٦)۔ الممسوح لايقاسُ على المغسول. فافهم!

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(محل امتحان نمبر:۲۱) **فاقبل بهما وأدبر الخ**

''اقبال'' لغۃً پیچھے سے آگے کی جانب لانا۔ ''ادبار'' آگے سے پیچھے کی طرف لے جانا۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے مسح فرمایا اور مقدم رأس یعنی اگلے حصہ سے مسح کی ابتداء فرمائی جیسا کہ الفاظِ حدیث خود اس پر دلالت کرتے ہیں ''بدأ بمقدم رأسه''

اعتراض:

یہاں اعتراض ہوسکتا ہے کہ ''أقبل بهما وأدبر'' کا تقاضہ یہ ہے کہ مسح کی ابتداء پیچھے سے ہوئی اور ''بدأ بمقدم رأسه'' کا تقاضہ یہ ہے کہ آگے سے ہوئی ہے۔ لہٰذا حدیث کا اوّل و آخر معارض ہوگیا اور تعارض لازم آیا۔ فما الجواب؟

جواب:

جواب: یہ ہے کہ واوٗ مطلقاً جمع کے لیے لایا گیا ہے، ترتیب مقصود نہیں ہے، یعنی راوی اقبال وادبار کو بیان کرنا چاہتے ہیں یہ مقصود نہیں ہے کہ انہوں نے پہلے اقبال کیا پھر ادبار، اس کی دلیل یہ ہے کہ بخاری کی ایک روایت میں ادبار کو مقدم کیا گیا ہے، اگر ترتیب مقصود ہوتی تو تعارض لازم آتا وإلّا فلا۔ یہاں اقبال کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب جب اقبال وادبار کو جمع کرتے ہیں تو اقبال کو مقدم کرتے ہیں۔

نیز ترتیب ذکری میں احسن کو مقدم کیا جاتا ہے۔ اور اقبال بہ مقابلہٗ ادبار احسن ہے۔ فاندفع الإشكال وارتفع التعارض.

اختلافِ ائمہ:

مسح کی ابتداء کہاں سے ہو؟ اس سلسلہ میں تین مذاہب ہیں:

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(۱) مقدمِ رأس سے۔ (۲) مؤخرِ رأس سے۔ (۳) وسطِ رأس سے۔

جمہور ائمہ: فرماتے ہیں کہ ابتداء مسح مقدم رأس سے ہو۔

وکیع ابن الجراح: کہتے ہیں کہ مؤخر رأس سے ہو۔

اور حسن بن صالح: کہتے ہیں کہ وسطِ رأس سے ہو۔ دلائل:

(۱) جمہور کی دلیل حدیثِ باب ہے: بدأ بمقدم رأسه۔

(۲) وکیع ابن الجراح کی دلیل حضرت ربیع بنت معوذ کی روایت ہے:

بدأ بقدم رأسه ثم بمقدمه۔

(۳) اور حسن بن صالح کی دلیل ربیع بنت معوذ ہی کی روایت ہے: "مسح الرأس كله من قرن الشعر". (ابوداؤد، باب صفة الوضوء)

جمہور اس استدلال کا جواب دیتے ہیں کہ ربیع بنت معوذ کی روایت اِس باب میں مضطرب فیہ ہے۔ لہٰذا حدیث مضطرب سے استدلال تام نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "ربیع بنت معوذ کی روایت سے جواز ثابت ہوتا ہے" کیوں ہم مؤخر، مقدم اور وسط رأس سے جوازِ مسح کے قائل ہیں، بہت ممکن ہے کہ آپ نے مختلف کیفیات سے مسح فرمایا ہو، تاکہ جواز ثابت ہوجائے، مگر افضل مقدم رأس سے ہی ابتداء کرنا ہے؛ کیونکہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی روایت ابتداء بمقدم الرأس میں صریح ہے۔ اور امام ترمذیؒ نے اسے "أصح ما في الباب" قرار دیا ہے۔

(محل امتحان نمبر:۲۲) الاختلاف في الإستطابة بأقل من ثلاثة أحجار

عن مالك عن أبي الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا توضأ أحدكم فليجعل في أنفه ماءً ثم لينثر، ومن استجمر فليوتر.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

حدیثِ مذکور میں دو باتیں ذکر کی گئی ہیں:

(۱)۔ ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنا، اس کا بیان گزر چکا ہے۔

(۲)۔ استنجاء میں طاق عدد استعمال کرنا چاہیے۔ یہ (استنجاء بالاحجار) اختلافی مسئلہ ہے۔

حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ صرف انقاءِ محل واجب ہے، کوئی خاص عدد واجب نہیں حتیٰ کہ اگر ایک ہی ڈھیلہ سے کام چل جائے تو ایک ہی کافی ہے اور اگر تین سے زائد کی ضرورت پڑے تو زیادتی واجب ہے یہاں تک مقصود (انقاء) حاصل ہو جائے۔ اور چونکہ تثلیث ثابت ہے اس لیے اگر تین سے کم میں بھی کام چل جائے تب بھی تثلیث مسنون ہے اور ایتار (طاق عدد) مستحب ہے۔ وبہ قال الإمام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ.

دلائل:

امام شافعیؒ کی دلیل حضرت سلمان فارسیؓ کی روایت ہے: ''نہانا أن نستنجي بأقل من ثلاثة أحجار''.

(۱) حضرت امام اعظمؒ کی دلیل ابو ہریرہؓ کی روایت ہے: قال: أنه علیه السلام قال: من استجمر فلیوتر من فعل فقد أحسن و من لا فلا حرج.

(رواہ ابن ماجہ وأبو داؤد والبیهقي)

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ استنجاء میں طاق عدد استعمال کرنا چاہیے۔ جس نے اس پر عمل کیا تو اچھی بات ہے ورنہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

نفیِ حرج عدم وجوب کی دلیل ہے، جب آپ نے ایتار کا عدم وجوب ہونا ثابت فرما دیا تو تثلیث کا عدم وجوب بھی ثابت ہو گیا؛ کیونکہ ایتار عام ہے اور تثلیث خاص اور عام کی نفی سے خاص کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی سے امام بیہقیؒ کا اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے جو انہوں نے اس روایت سے استدلال پر کیا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث پاک میں ایتار کی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

نفی کی گئی ہے تثلیث کی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ ایتار عام ہے اور تثلیث خاص اور عام کی نفی سے التزاماً خاص کی نفی ہو جاتی ہے۔

(۲)۔ احناف کی دوسری دلیل:

عن عائشة مرفوعًا: قالت: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا ذهب أحدكم إلى الغائط فليذهب بثلاثة أحجارٍ يستطيب بهنّ. فإنها تجزئ عنه.

اِس روایت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ مقصود صرف اور صرف ''انقاء'' ہے کسی خاص عدد کا استعمال مقصود نہیں اور چونکہ غالباً تین عدد ڈھیلوں سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے اس لیے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

نیز ''انقاء'' کے مقصود اصل ہونے پر ''معجم طبرانی'' کی ایک روایت دال ہے۔

عن أبي ايوب قال: أنه عليه السلام قال: ''إذا تغوط أحدكم فليمسح بثلاثة أحجار فإن ذلک كافيه''.

وقال الهيثمي: ''ورجاله موثقون، إلّا ان أباشعيب صاحب أبي أيوب لم أر فيه تعديلًا ولا جرحًا. (مجمع الزوائد: ج:۱، ص:۲۱۱)

معلوم ہوا کہ حدیث میں تین کا عدد محض عمومی احوال کے لیے ہے ورنہ در حقیقت مقصود عند الشرع انقاء ہی ہے۔

وفي ''المرقات'' و ''البدائع'': ولأن المقصود هو الإنقاء فيعتبر ماهو المقصود. (مرقات: ج:۱، ص:۳۴۹، بدائع: ج:۱، ص:۱۰۳)

اور حضرت امام طحاویؒ نے تثلیث کے عدمِ وجوب پر بطریقِ نظر استدلال پیش کیا ہے، فقال في ''شرح معانی الآثار'' وأما بطريق النظر الخ. (ج:۱، ص:۳۹)

حاصل نظر یہ ہے کہ پیشاب و پاخانہ و دیگر نجاسات زائل کرنے میں کوئی خاص عدد ملحوظ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

نہیں ہے بلکہ جتنی مرتبہ دھونے سے پاک ہوجائے وہی فرض ہے اسی طرح استنجاء میں بھی حکم ہونا چاہیے کہ جتنے عدد احجار سے طہارت سے حاصل ہوجائے وہی واجب ہونہ کہ خاص عدد۔

(محل امتحان نمبر: ۲۳) غسل الرجل ومسحه

عن مالک أنه بلغهُ ان عبدالرحمٰن بن أبي بكر دخل على عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم يوم مات سعد بن أبي وقاص فدعا بوضوءٍ، فقالت له عائشة: ياعبدالرحمٰن! أسبغ الوضوء فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ويل للأعقاب من النار. (مؤطا امام مالک: ص:۶)

الويل: أي الهلاكة والعذاب. اعقاب: جمع عقب بمعنى "ایڑی" من النار: أي ويل من النار للأعقاب. فالويل وادٍ من جهنم.

حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے اس شخص کو "ویل" کی وعید سنائی ہے جو اس طرح وضوء کرے کہ اس کی ایڑی خشک رہ جائے۔ معلوم ہوا کہ وضوء میں ایڑی خشک نہیں رہنی چاہیے بلکہ استیعاب فی الغسل ضروری ہے۔ نیز دلالۃً یہ بھی ثابت ہوا کہ وظیفہ رجل، غسل ہے نہ کہ مسح جیسا کہ بہ قرأت کسر، اس کا توہم ہوتا ہے کما قاله الفرقة الإمامية من الشيعية.

الإختلاف في غسل الرجل ومسحه:

ائمہ اربعہ اور جمہور علماء اہل سنت والجماعت فرماتے ہیں کہ "غسل رجلین کا وظیفہ غسل" ہے یعنی پاؤں دھونا واجب وفرض ہے، مگر بعض اہلِ فرقِ باطلہ اس میں اختلاف کرتے ہیں چنانچہ "فرقۂ امامیہ" (شیعہ) ابوعلی جبائی اور داؤد ظاہری کا اختلاف ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

فرقۂ امامیہ کہتے ہیں کہ رجلین کا وظیفہ مسح ہے نہ کہ غسل، أی المفروض في الرجلین هو المسح لا غیر (کما في البدائع: ج:۱، ص:۷) یعنی ہر حال میں پاؤں پر مسح کیا جائے گا سواء کان لَبِسَ الْخُفَّ أمْ لَا.

داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ مسح وغسل دونوں کا اختیار ہے۔ اگر کسی نے صرف مسح کرلیا تو بھی کافی ہے اور غسل کرلیا تب بھی صحیح ہے۔

دلائل:

روافض وشیعہ کہتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صفتِ وضوء بیان فرماتے ہوئے فرمایا ہے: ’فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ‘‘ ’’أَرْجُلِكُمْ‘‘ عطف ہے ’’رُؤُسِكُمْ‘‘ پر ہے، لہٰذا جس طرح مسح رأس فرض ہے اسی طرح مسح رجلین بھی فرض ہوگا۔ (المرقات: ج:۱، ص:۱۶)

داؤد ظاہری کہتے ہیں: ’’وَأَرْجُلَكُمْ‘‘ میں نصب اور جر دونوں قراءت ہیں، لہٰذا دونوں کا اختیار ہوگا۔ جمہور علماء اہلِ سنت والجماعت فرماتے ہیں: کہ غسلِ رجل فرض ہے اور ’’أَرْجُلِكُمْ‘‘ کی قرأت جر، وجوبِ غسل کے منافی نہیں؛ کیونکہ اس کے معطوف علیہ میں دو احتمال ہے، پہلا احتمال یہ ہے کہ مغسولات پر معطوف ہو، دوسرا احتمال ممسوحات پر معطوف ہونے کا ہے اور دوسرا احتمال احادیثِ متواترہ کے خلاف ہے اس لیے پہلا احتمال یعنی عطف علی المغسولات متعین ہوگیا۔

اب اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ جب ممسوحات پر عطف ہونا محال ہوگیا تو پھر قرأت جر کی روایت کیوں کر صحیح ہوسکتی ہے؟ حالاں کہ قرأت جر ثابت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جنہوں نے قرأت جر کی روایت نقل فرمائی ہے سب کا عمل غسلِ رجل کا تھا، لہٰذا محض جر کی قرأت کی وجہ سے مسح رجل ثابت نہیں ہوگا۔

مگر اس پر پھر اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ جب قرأت جر کا کوئی فائدہ نہیں تو قرأت کا

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

کیا مطلب ہے؟ یعنی جب مسح کی اجازت نہیں جو کہ اثر ہے قرأت جر کا، تو مؤثر کا بے اثر ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرأت جر اس وجہ سے نہیں کہ مسح بھی جائز ہے بلکہ یہاں صنعت استخدام ہے۔ وہ اس طور پر کہ ممسوح پر عطف کیا گیا ہے اور مراد غسل خفیف ہے؛ کیونکہ اس زمانہ میں پانی کی قلت تھی اگر غسل مبالغۃً واجب کیا جاتا تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے۔ پانی کے کم ہونے کی وجہ سے غسل خفیف کا حکم دیا اور ممسوح پر عطف کر کے اس کی طرف اشارہ کیا۔ پھر رسولِ خدا ﷺ کی زبان رسالت نے یہ بھی بتلا دیا کہ ممسوح پر عطف کرنے سے یہ مت سمجھو کہ مسح کافی ہے بلکہ پورے پاؤں کا (إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ) استیعاب فرض ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ویل للأعقاب من النار“ کہ خبردار کبھی بھی یہ گمان مت کرنا کہ مسح رجلین کافی ہے۔ بلکہ غسل ضروری ہے حتیٰ کہ اگر ایڑی خشک رہ گئی تو تمہارا وضو نہیں ہوگا اور اگر اسی حالت میں تم نے نماز پڑھ لی تو نماز ادا نہ ہوگی اور تمہیں سزا دی جائے گی۔

اس تاویل کے علاوہ اور بہت سی تاویلات کی گئی ہیں۔ فترکناہ خوفاً للإطناب.

اسی تقریر سے فرقہ امامیہ اور داؤد ظاہری وغیرہ کے استدلال کا جواب بھی ہوگیا۔

(محل امتحان نمبر: ۲۴) وضوء النائم إذا قام إلى الصلوٰة

عن مالک عن أبي الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا استيقظ أحدكم من نومه فليغسل يدهٗ قبل أن يدخلها في وضوئه، فإن أحدكم لا يدري أين باتت يده. (مؤطا مالک: ص: ۷)

اِس حدیث میں استیقاظ من نوم اللیل کی قید نہیں ہے، بعض روایات میں ”من

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اللیل“ کی قید مذکور ہے جس کی بنا پر امام احمدؒ ”نوم اللیل“ سے استیقاظ من النوم کو مقید فرماتے ہیں، مگر جمہور ائمہ فرماتے ہیں کہ یہ قید احترازی نہیں بلکہ قید اتفاقی ہے جیسا کہ حدیث باب اور بخاری کی ایک روایت (جس میں من اللیل کی قید نہیں ہے) شاہد ہے۔ اگر قید اتفاقی نہ ہوتی تو اس قید کو ذکر کرنا ضروری ہوتا۔ معلوم ہوا کہ یہ قید اتفاقی ہے۔

الإختلاف في نجاسة الماء إذا غمس فيه اليد قبل غسلها:

امام احمدؒ: فرماتے ہیں کہ اگر رات کی نیند سے بیدار ہوا ہے اور بغیر ہاتھ دھوئے ہوئے ماء قلیل میں ہاتھ ڈال دیا تو پانی ناپاک ہوجائے گا۔

امام شافعیؒ: کراہت ماء کے قائل ہیں اور نوم لیل کی قید نہیں لگاتے ہیں۔

امام مالکؒ: مطلقاً طہارت کے قائل ہیں۔

حضرت الامام الاعظمؒ: فرماتے ہیں کہ اگر یقین ہو کہ ہاتھ میں نجاست لگی ہوئی تھی تو پانی (قلیل) ناپاک ہوجائے گا اور اگر غلبۂ ظن اور یقین نہ ہو بلکہ محض گمان ہو تو پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

دلائل:

امام احمدؒ: کا استدلال حدیثِ باب سے ہے کہ آپ ﷺ نے قبل الغسل، برتن میں ہاتھ ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔

امام شافعیؒ و مالکؒ: فرماتے ہیں کہ طہارت امر یقینی ہے اور نجاست کا محض گمان ہے۔ والأصل: ان ماثبت بالیقین لایزول بالشک. (قواعد الفقه: ص:۱۱)

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ محض شبہات سے نجاست ثابت نہیں ہوگی، بلکہ اگر یقین ہوجائے کہ ہاتھ پر نجاست لگی تھی اور بغیر غسل کیے ہوئے ہاتھ اس نے ڈال دیا ہے تو اب نجاست کا یقین ہوگیا اس لیے ماء قلیل ناپاک ہوجائے گا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

حکم الخارج من غیر السبیلین ناقض للوضوء أم لا:

قال مالک: الأمر عندنا أنه لایتوضأ من رعاف ولامن دم ولامن قیح یسیل من الجسد ولایتوضأ إلّا من حدث یخرج من دُبُر اوذکر أونوم. (مؤطامالک: ص:۷)

یہاں دومسئلے ہیں:

(۱) خارج من غیرالسبیلین ناقضِ وضوء ہے یانہیں؟

(۲) النوم ناقض أم لا؟

ائمہ اربعہ خارج من السبیلین کے ناقضِ وضوء ہونے میں متفق ہیں۔

البتہ امام مالکؒ خارج من السبیلین میں بھی اور خارج من غیرالسبیلین میں بھی خارج کے معتاد ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔

الغرض اگرنجاست سبیلین سے نکلے تو ناقض ہے اور خارج من غیرالسبیلین میں اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ و مالکؒ:

امام شافعیؒ مخرج کے معتاد ہونے کی شرط لگاتے ہیں لہٰذا خارج من غیرالسبیلین ان کے یہاں ناقض نہیں ہےاورامام مالکؒ بھی مخرج کے معتاد ہونے کی شرط ہونے کے قائل ہیں نیز خارج کے معتاد ہونے کوبھی شرط قرار دیتے ہیں اس لیے ان کے یہاں خارج من غیرالسبیلین ناقض نہیں ہے حتیٰ کہ دمِ استحاضہ بھی ناقض نہیں لعدم کونه معتادًا.

جمہور: حضرت امام اعظمؒ، امام احمدؒ اور جمہور علماءؒ کے نزدیک خروجِ نجاست من البدن ناقض ہے، لہٰذا پیشاب وغیرہ ناقض ہوا، خارج من احدالسبیلین ہونے کی وجہ سے اوردم، رُعاف، قئ وغیرہ ناقض ہوئے خروجِ نجس من البدن ہونے کی وجہ سے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلائل:

امام مالکؒ وشافعیؒ، حضرت جابرؓ کی روایت سے استدلال فرماتے ہیں:

۱۔ عن جابر أن النبي صلى الله عليه وسلم كان في غزوة ذات الرقاع فرمى رجل بسهم فنزعه الدم فركع وسجد ومضى في صلوته. (بخاری: ج:۱، ص:۲۹)

امام ابوداوُدؒ نے بھی اس روایت کو نقل فرمایا ہے اور بالتفصیل ذکر کیا ہے۔

(ابوداوُد: ج:۱، ص:۲۶)

۲۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم احتجم فصلى ولم يتوضأ.

طریقۂ استدلال:

طریقۂ استدلال یہ ہے کہ مسلسل تیر لگنے سے یقیناً بے شمار قطراتِ دم نکلے ہوں گے، اسی طرح حجامت سے بھی خون نکلا ہوگا۔ اگر خروج نجس من البدن ناقض ہوتا تو حضرت عباد بن بشر (جن کو غزوۂ ذات الرقاع میں تیر لگے تھے) وضوء فرماتے اور آں جناب ﷺ بھی وضو فرماتے۔ انہوں نے وضو نہیں فرمایا یہ دلیل ہے کہ خارج من غیر المخرجین (قبل، دبر) ناقض نہیں ہے۔

دلائل احناف:

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: كل مايخرج من السبيلين والدم والقيح إذا خرجا من البدن فتجاوزا إلى موضع يلحقه حكم التطهير والقئ ملأ الفم.

(هدایه: ج:۱، ص:۲۳)

صاحبِ ہدایہ دلیل پیش فرماتے ہیں: ۱۔ ولنا قوله عليه السلام: الوضوء من كل دم سائل. (زیلعی: ج:۱، ص:۱۲۱، دارقطنی: ج:۱، ص:۱۵۷)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

معلوم ہوا کہ دمِ سائل نجس ہے اور علت نجاست ''نجس'' ہوتا ہے، لہٰذا خارج من غیر السبیلین بھی ناقض ہوگا۔

۲۔ عن عائشة قالت: جاءت فاطمة بنت أبي حبيش إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله إني إمرأة استحاض فلاأطهر، أفادع الصلوٰة؟ فقال: لا، انما ذٰلک دم عرق، فتوضئ لكل صلوٰة. (بخاری شریف)
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رگ کا خون ناقض ہے۔ والعرق ليس من احد السبيلين یعنی عرق (رگ) غیر سبیلین ہے اور دم عرق کے خروج پر وضوء کا حکم ہے لہٰذا خروج من احد السبیلین کی تخصیص درست نہیں۔

۳۔ عن عائشة قالت: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من أصابهٗ قيئ أو رُعاف أوقلس أو مذي فلينصرف، فليتوضأ، ثم ليبنِ على صلوٰته وهو في ذٰلک ولايتكلم. (الترمذي: ج:۱، ص:۲۵)

جواب:

۱۔ حضرت جابرؓ کی روایت سے شافعیہ و مالکیہ کا استدلال تام نہیں؛ کیونکہ اس کا ایک راوی عقیل ہے جو ضعیف ہے۔ اور دوسرا راوی محمد بن اسحٰق ہے، جو متکلم فیہ ہے۔

۲۔ قال الخطابي: لست أدري كيف يصح الإستدلال به الخ. یعنی علامہ خطابی شافعی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام شافعیؒ کا استدلال صحیح نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاشبہ تیر لگنے سے یقیناً بہت زیادہ خون نکلا ہوگا اور خون بالاتفاق نجس ہے جو کپڑے پر پڑا ہوگا اور بدن پر بھی خون کے چھینٹے پڑے ہوں گے جس سے نماز صحیح نہیں ہونی چاہیے، مگر پھر بھی انہوں نے نماز پڑھی، لہٰذا یہ کہا جائے گا نماز کی لذات اور مناجات ربی سے اس کی طرف ان کو التفات نہ ہوا ہو، گویا کہ یہ مسئلہ ان کے اس احوالِ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

باطنی کی وجہ سے ان ہی کے ساتھ خاص ہو، پس اس سے استدلال درست نہیں۔

(كذا في "بذل المجهود" ج:١، ص:١٢١ وهامش الترمذي: ج:١، ص:٢٥)

دوسری دلیل کا جواب:

یہ ہے کہ اس حدیث کی اسناد میں "صالح بن مقاتل" ضعیف ہیں۔ اور سلیمان بن داؤد کے متعلق امام دارقطنی فرماتے ہیں: ليس هٰذا بالقوي، وسليمان بن داؤد مجهول. (كما في البذل: ج:١، ص:١٢٣)

دوسرا مسئلہ: ألنوم ناقض أم لا؟

نوم انبیاء کے عدم ناقض ہونے پر سبھی کا اتفاق ہے اور انبیاء کے علاوہ لوگوں کی نیند کے بارے میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں بہت سارے اقوال ہیں۔ علّامہ نوویؒ نے آٹھ اور علّامہ عینیؒ نے دس اقوال ذکر کیے ہیں، تمام اقوال کا ذکر کرنا زیادہ سودمند بھی نہیں اور نہ ہی مناسب ہے خوفاً للإطناب۔ لہٰذا ان اقوال کا خلاصہ ذکر کیے دیتا ہوں۔ ان کا خلاصہ تین قول ہیں: (١) غیر ناقض مطلقاً (٢) ناقض مطلقاً (٣) التفریق بین النوم۔ یعنی نوم کی صورت کیا ہے اگر نوم غالب ہے تو ناقض ورنہ نہیں۔

مذاہب:

مطلقاً غیر ناقض: کا قول حضرت ابن عمرؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور شعبہؒ سے منقول ہے۔

مطلقاً ناقض: حضرت حسن بصریؒ، امام زہریؒ اور اوزاعیؒ اس کے قائل ہیں۔

سواء كان النوم قليلاً أو كثيراً عندهم.

نوم غالب ناقض ہے:

جمہور اور ائمہ اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر نوم غالب ہے تو ناقض اور اگر نومِ غالب

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

نہیں تو غیر ناقض، ان حضرات کا اتفاق ہے کہ بالذات نوم ناقض وضو نہیں، بلکہ خروجِ ریح کے اندیشہ کی وجہ سے ناقض ہوتا ہے اور ظاہری بات ہے کہ نوم غیر غالب میں مظنۂ خروجِ ریح پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ نومِ غالب میں ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ استرخاءِ مفاصل متحقق ہوجانے کی وجہ سے یہ مظنہ قوی ہوجاتا ہے اس لیے انہوں نے استرخاءِ مفاصل کو شرعاً خروجِ ریح کے قائم مقام قرار دیا۔

كذا يفهم من الفاظ الحديث ''إذا إضطجع استرخت مفاصلة''

(والبسط والتفصيل في المطولات)

(محل امتحان نمبر:۲۵) الطهور للوضوء

عن مالك عن سفيان بن سليم عن سعيد بن سلمة من آل بني الأزرق عن مغيرة بن أبي بردة هو من بني عبد الدار أنه أخبرهُ أن أبا هريرة يقول: جاء رجل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: يا رسول الله! إنا نركب البحر ونحمل معنا القليل من الماء، فإن توضأنا به عطشنا، أفنتوضأ من ماء البحر، فقال رسول الله صلى الله علية وسلم: هو الطهور ماءهُ والحل ميتتهُ.

حدیث پاک کا ما حصل اور خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر ماء بحر کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کیا ہمارا اس پانی سے وضو کرنا درست ہوگا؟

آپ ﷺ نے پانی کی خلاقت یعنی طہارت بیان فرمادی کہ پانی پاک ہوتا ہے۔ اور جب کہ یہاں کوئی نجاست بھی نہیں ہے تو پھر وضوء کرنے میں کیا مضائقہ؟

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

سببِ سوال:

۱۔ شاید کہ صحابہ کرامؓ کو اللہ پاک کے ارشاد ''وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ'' اور حدیث رسول پاک ''فإن تحت البحر نارًا وتحت النار بحرًا'' سے یہ شبہ ہوا کہ ماءِ بحر غضبِ الٰہی کا مظہر ہے پھر وہ وسیلۂ تقرب کیسے بن سکتا ہے اور وضوء وسیلۂ تقریب یعنی نماز کے لیے شرط ہے۔ پھر جب شرط صحیح نہیں (وضوء صحیح نہیں) تو وضوء کا فائدہ کیا ہوگا؟

۲۔ چونکہ ان کا مشاہدہ تھا نیز تخمینہ بھی تھا کہ یقیناً بے شمار جانور اس میں مرتے ہوں گے جس سے طہارتِ ماء میں شک وشبہ پیدا ہوگیا اس لیے انہوں نے دریافت فرمایا۔ الغرض ان کا سوال کسی امر محقق کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ محض شک وشبہ کی وجہ سے تھا، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ''ھو الطھور ماءہ'' تاکیداً حکم فرمایا: ''ھو الطھور ماءہ'' کہنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہاں مقصود خلقت ماء کو بتلانا ہے تاکہ آئندہ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم أجمعین کسی دوسرے جزئیات کی توضیح نہ چاہیں، جب آپ نے خلقتِ ماء بیان فرمادی تو اب سب کو معلوم ہوگیا کہ ماءِ بحر طاہر ومطہر ہے، لہٰذا اس سے وضوء، غسل اور غسل ثوب بھی صحیح ہوگا۔ نیز کپڑے یا بدن پر اس پانی کے لگ جانے سے کوئی حرج نہیں لأن الماء طاھر ومطھر. فیزیل الحدث لایُثْبِتُهُ.

اعتراض:

صحابہؓ نے صرف ماءِ بحر کے بارے میں سوال کیا ہے میتۂ بحر کے متعلق تو سوال نہیں تھا، پھر بھی آپ ﷺ نے ''والحل میتته'' کہہ کر مردار کا حکم کیوں بیان فرمایا؟

جواب:

جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ صحابہؓ کو پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو سمجھا کہ اسی طرح غذا کی بھی ضرورت پیش آئے گی اور وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ میتۃ حرام ہے، لہٰذا اس حکم

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

مطلق میں میتہ بحری بھی شامل ہیں اس لیے وہ بھی حرام ہونی چاہیے۔ آپ نے شفقۃً اس کا بھی جواب عنایت فرمادیا کہ اگر چہ میتہ برّی حرام ہے، مگر میتہ بحری علی الاطلاق حرام نہیں، بلکہ مچھلی کے علاوہ حرام ہے اور سمکِ طافی بھی حکمِ حلت سے مستثنیٰ ہے۔

(محل امتحان نمبر:۲۶) **الحل میتته**

یہاں تین مسئلے ذکر کیے جائیں گے:

(۱)۔ مائی جانوروں کی حلت وحرمت کا مسئلہ۔

(۲)۔ سمکِ طافی کی حلت وحرمت۔

(۳)۔ جھنگہ مچھلی میں اختلاف۔

المسئلة الأولى: مائی جانور:

اس سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ تمام دریائی جانور حلال ہیں یا بعض؟

امام مالکؒ: فرماتے ہیں کہ تمام دریائی جانور حلال ہیں سوائے خنزیر کے۔

امام اعظمؒ: حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سمک (جو طافی نہ ہو) کے علاوہ تمام جانور حرام ہیں۔

امام شافعیؒ: امام شافعیؒ سے چار قول منقول ہیں، مشہور اور مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ ضفدع کے علاوہ تمام بحری جانور حلال ہیں علّامہ نوویؒ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

وقال عليه الفتویٰ عند الشافعية.

الغرض: جس طرح امام مالکؒ تمام بحری جانوروں کی حلت کے قائل ہیں اسی طرح امام شافعیؒ بھی حلت کے قائل ہیں۔ إلّا ان الإمام مالك استثنیٰ الخنزير منه. والشافعي الضفدع. اور امام ابوحنیفہؒ تمام جانوروں کی حرمت کے قائل ہیں صرف سمک کو حرمت کے حکم سے مستثنیٰ رکھتے ہیں۔ یعنی مالکیہ وشافعیہ کا استثنیٰ حلت سے ہے اور حنفیہ کا حرمت سے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلائل:

امام مالکؒ وشافعیؒ کا مستدل ارشادِ ربانی ہے: ۱۔ ’’أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ‘‘ الصيد عام يشمل الجميع ما في البحر.

۲۔ حدیث باب ہے: والحل ميتته، یہاں ہر میتۃ ماء کی حلت کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ بخاری شریف ’’باب غزوة سيف البحر‘‘ کی روایت ہے: ’’فألقى لنا البحر دابة يقال لها العنبر‘‘ لفظ دابہ سے معلوم ہورہا ہے کہ نکلنے والا جانور مچھلی کے علاوہ تھا۔

پھر امام مالکؒ، خنزیر کو اللہ پاک کے ارشاد ’’وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ‘‘ سے مستثنیٰ مانتے ہیں اور امام شافعیؒ ضفدع کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں ان احادیث کی وجہ سے جن میں قتل ضفدع سے ممانعت آئی ہے۔

دلائلِ احناف:

۱۔ قوله عز وجل: ’’وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ‘‘ اللہ پاک نے انسانوں کے لیے خبائث کو حرام قرار دیا ہے اور خبائث کے اندر ہر وہ چیز داخل ہے جس کو فطرتِ انسانی خبیث جانے اور یہ ظاہر بات ہے انسان مچھلی کے علاوہ سمندر کے دیگر جانوروں کو خبیث سمجھتے ہیں، لہٰذا سمک کے علاوہ تمام جانور خبائث کے اندر داخل ہوں گے اور اس کی حرمت بیان کی گئی ہے۔

۲۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے سمک کے علاوہ دیگر دریائی جانوروں کا تناول فرمانا ثابت نہیں، اگر جائز ہوتا تو بیانِ جواز کے لیے کم از کم ایک مرتبہ ضرور تناول فرماتے۔

جواب:

(۱) مالکیہ اور شافعیہ کا ’’أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ‘‘ سے استدلال درست نہیں، کیونکہ استدلال کی صحت کے لیے یہاں ضروری ہے کہ صید کو اسم مفعول ’’مصید‘‘ کے

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

معنی میں اور اضافتِ استغراقی مرادلیا جائے۔ اور صید کو مصید کے معنی میں لینا مجاز ہے جس کی طرف رجوع بلاضرورت درست نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ صید کو اپنے حقیقی معنیٰ پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے؛ کیونکہ یہاں بیان ماکولات کا نہیں بلکہ ان افعال کا ہے جو محرم کے لیے روا اور ناروا ہے۔ یہاں بتلانا یہ مقصود ہے کہ سمندر میں شکار کرنا محرم کے لیے جائز ہے، کھانا حلال ہے یا حرام؟ اس کا بیان نہیں۔

اور یہاں اضافت استغراق کے لیے نہیں ہے بلکہ عہد خارجی کے لیے ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض صید یعنی سمک تمہارے لیے جائز ہے؛ کیونکہ سمک کی حلت ثابت ہے اسے آپ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

۲۔ حدیث الباب سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ والحل میتته سے عام میتہ مراد نہیں، بلکہ خاص ہے اور اس سے اشارہ ہے آپ ﷺ کے قول ''أحلت لنا میتتان ودمان فأما المیتتان فالحوت والجراد'' کی طرف جس سے سمک کی حلت ثابت ہوتی ہے۔

۳۔ الحل حلال کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ الطاھر کے معنیٰ میں ہے، چونکہ سلسلۂ کلام میں طہارت کا بیان ہے؛ کیونکہ صحابہ کو سمندر میں مرنے والے جانوروں کے متعلق پاکی وناپاکی کا شبہ ہوا تھا اسی شبہ کے ازالہ کے لیے آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ ''الحل'' الطاھر کے معنیٰ میں ہے اور طہارت شئ، جوازِ اُکل کی دلیل نہیں ہے۔ جیسا کہ مٹی پاک ہے مگر اس سے مٹی کے کھانے کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ حدیث بخاری سے بھی استدلال درست نہیں؛ کیونکہ امام بخاری نے دونوں طرح کی روایت ذکر فرمائی ہے ایک روایت میں لفظ دابہ ہے اور دوسری روایت میں ہے ''فالقی البحر حوتًا میتًا'' لہٰذا یہ دوسری روایت پہلی روایت کی تشریح ہوگی یعنی پہلی روایت میں جو دابہ کا لفظ ہے اس سے سمک مراد ہوگا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دوسرا مسئلہ: سمک طافی کی حرمت وحلت کا بیان:

طافی وہ مچھلی ہے جو طبعی موت مری ہو، یعنی خارجی سبب کی وجہ سے اس کی موت واقع نہ ہوئی ہو اور وہ مر کر اُلٹی ہوگئی ہو۔

ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ) کے نزدیک سمک طافی حلال ہے۔ اور امام اعظمؒ کے نزدیک حرام ہے۔

دلائل:

۱۔ ائمہ ثلاثہ حدیث باب سے استدلال فرماتے ہیں: ''والحل میتته'' میتة سے غیر مذبوح مراد لیتے ہیں، لہٰذا یہ سمکِ طافی اور غیر طافی دونوں کو شامل ہے۔

۲۔ حدیث سے استدلال فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو مری ہوئی مچھلی ملی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اُسے کھالیا۔

احناف کا مستدل حضرت جابرؓ کی روایت ہے: قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ماألقی البحر أو جزر عنه فکلوہ. وما مات وطفأ فلاتاکلوہ.

(ابن ماجه: ص: ۲۳۴، ابواب الصید باب الطافي من صید البحر)

جواب:

۱۔ الحل میتته سے ائمہ ثلاثہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہاں میتة سے مراد غیر مذبوح نہیں بلکہ مالیس له دم سائل ہے، لہٰذا استدلال صحیح نہیں۔

۲۔ الحل بمعنی الطاھر ہے۔ ۳۔ حدیث میں سمکِ طافی کی صراحت نہیں، بلکہ قرینہ یہ بتلا رہا ہے کہ وہ سببِ خارجی کی وجہ سے مری تھی؛ کیونکہ صحابہ کرامؓ نے سمندر کے کنارے پایا تھا۔ یہ قرینہ ہے کہ پانی اس سے دُور ہوگیا جس کی وجہ سے وہ مرگئی اور یہ فطری موت نہیں، بلکہ پانی کا دُور ہوجانا یہ سببِ خارجی ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

المسئلة الثالثة: جھینگہ کی حلت وحرمت کا مسئلہ۔

شافعیہ و مالکیہ: تؤکل ما في البحر سوی الضفدع (عند الشافعية وسوی الخنزیر (عند المالكية) اس لیے ان کے یہاں تو بلاشبہ یہ حلال ہیں۔ عند الاحناف اس کے سمک ہونے اور نہ ہونے پر اس کا مدار ہے، فمن قال أنه سمک فقال بجوازه ومن قال: أنه غيره فعنده لا يحل. (درسِ ترمذی تقریر حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم ج:۱، ص:۲۸۳ پر بالتفصیل کلام کیا گیا ہے۔ فليراجع هنا)

(محل امتحان نمبر:۲۷) الوضوء مما تشرب منه الهرّة

عن مالک عن اسحٰق بن عبد الله بن أبي طلحة الأنصاري عن حميدة بنت أبي عبيدة بن فروة عن خالتها كبشة بنت كعب بن مالک وكانت تحت ابن أبي قتادة أنها أخبرتها: أن أبا قتادة دخل عليها، فسكبت له وضوءً فجاءت هرة لتشرب منه، فأصغى لها أبو قتادة الإناء حتى شربت، قالت كبشة: فرآني أنظر إليه فقال: أتعجبين يا ابنة أخي؟ قالت: فقلت: نعم. فقال: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنها ليست بنجس، إنما هي من الطوافين عليكم أو الطوافات. (مؤطا امام مالک: ص:۸، امام محمد: ص:۸۳)

اِس حدیث پاک سے سورِ ہرہ کا مسئلہ نکلتا ہے۔ اس سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ اگر اس کے منہ پر نجاست لگی ہوئی ہو تو بالاتفاق پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اور اگر ظاہری نجاست نہ ہو تو اختلاف ہے کہ بلا کراہت طاہر ہے یا مع الکراہت؟

معلوم ہوا کہ سورِ ہرہ (اگر ظاہری نجاست نہ ہو تو) باتفاق ائمہ اربعہ طاہر ہے نجس

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

نہیں ہے۔ برخلاف امام اوزاعیؒ کے۔ ان کے نزدیک سورِ ہرہ ناپاک ہے۔

امام اوزاعیؒ کا استدلال حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہے جس میں سنور کو سبع کہا گیا ہے۔ یعنی بلی کو درندہ قرار دیا گیا ہے اور درندہ کا جھوٹا نجس ہے لہٰذا سورِ ہرّہ بھی نجس ہوگا۔

مگر یہ استدلال صحیح نہیں؛ کیونکہ علّامہ ہیثمی فرماتے ہیں: ”وفیه عیسٰی بن المسیب وهو ضعیف“ (مجمع الزوائد: ج:۱، ص:۱۸۶ و۱۸۷ باب في السنور والكلب)

نیز اگرچہ اس کو سباع کہا گیا ہے مگر حدیث میں اس کے سور کی حلت کو بیان کیا گیا ہے۔ اور علت بھی بیان کی گئی ہے: إنما هي من الطّوّافين عليكم أو الطوافات. یعنی بوجہِ علت طواف اس کو سورِ سباع کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

اختلاف:

اگرچہ جمہور طہارت سورِ ہرہ کے قائل ہیں مگر کراہت وعدمِ کراہت میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ: امام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور امام ابو یوسفؒ بھی فرماتے ہیں کہ سورِ ہرہ بلا کراہت طاہر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مع الکراہت طاہر ہے۔

دلائل:

ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کی دلیل حدیثِ باب ہے: ”انّها ليست بنجس“ الخ.

امام اعظمؒ کی دلیل:

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے: ”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يغسل الإناءُ إذا ولغ فيه الكلب سبع مرات الخ“. وإذا ولغت فيه الهرة غسلت مرة. (ترمذي شريف: ج:۱، ص:۲۷)

۲۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابوہریرہؓ ہی سے موقوفاً روایت کیا ہے: يغسل

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

الإناء من ولوغ الهرة كما يغسل في ولوغ الكلب. (الطحاوي: ج:۱، ص:۱۲)

۳۔ عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم: طهور الإناء إذا ولغ فيه الهرة أن يغسل مرة أو مرتين. (الطحاوي: ج:۱، ص:۱۱)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورِ ہرہ نجس ہے، مگر علّت طواف کی وجہ سے اس میں تخفیف واقع ہوگئی ہے، لہٰذا کراہت ثابت ہوگئی۔ (وكذا في التعليق: ج:۱، ص:۲۲۵)

جواب:

ائمہ ثلاثہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ إنها ليست بنجس سے نجاست کی نفی تو ہوگئی مگر کراہت کی نفی نہیں ہوتی؛ کیونکہ دیگر روایاتِ صحیحہ میں اس کی ناپاکی کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً "السنور سبع" یہاں مقصود بیان حکم ہے یعنی جس طرح درندہ کا سور ناپاک ہے اسی طرح بلی کا سور نجس ہے۔ لہٰذا دو طرح کی احادیث متعارض ہوگئیں۔ لہٰذا دونوں روایتوں پر عمل کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ کہا جائے کہ "السنور سبع" میں تو مقصود بیان حکم ہی ہے، مگر علت طواف کی وجہ سے اس حکم میں تخفیف ہوگئی ہے۔ كما في الهداية: والمراد بيان الحكم. إلا أنه سقطت النجاسة. لعلة الطواف. فبقيت الكراهة. (هدایہ: ج:۱، ص:۴۵)

۲۔ آپ کا برتن جھکا دینا بیان جواز پر محمول ہے۔ اور جواز کراہت کے منافی نہیں۔ (البدائع: ج:۱، ص:۲۰۵)

۳۔ وفي الهداية: وما رواه محمول على ما قبل التحريم.

(الهدایہ: ج:۱، ص:۴۵)

(محل امتحان نمبر: ۲۸) ما لا يجب فيه الوضوء

عن مالك عن محمد بن عمارة عن محمد بن إبراهيم عن أم ولد لإبراهيم بن عبد الرحمن بن عوف. أنها سئلت أم

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: إني إمرأة أطيل ذيلي، وأمشي في المكان القذر، قالت أم سلمة: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ويُطَهِّرُهُ مابَعْدَهُ.

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دامن وغیرہ پر نجاست لگ جائے تو زمین سے رگڑ دینے کے بعد پاکی حاصل ہوجائے گی، جبکہ اس پر اتفاق ہے کہ اگر بدن یا کپڑے وغیرہ پر نجاست لگ جائے اور نجاست یابسہ نہ ہو تو غسل ضروری ہے اور تلوار پر لگی نجاست رگڑ دینے سے صاف ہوجاتی ہے، لہٰذا یہ روایت اتفاق کے خلاف ہے، لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے۔

تاویلات:

۱۔ بعض حضرات نے یہ تاویل کی ہے کہ محمد بن ابراہیم، ابراہیم بن عبدالرحمٰن کی اُمِ ولد سے یہ روایت منقول ہے جو مجہول ہے۔ مزید براں یہ کہ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ یہ عبدالرحمٰن بن عوف کی اُمِ ولد ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور بعض روایت میں آتا ہے کہ یہ عبدالرحمٰن بن عوف کی اُمِ ولد نہیں بلکہ ان کے لڑکے کی ہے، مگر لڑکے کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے ہود بن عبدالرحمٰن کہہ کر روایت کی ہے تو بعض نے ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف۔ لہٰذا یہ مضطرب حدیث ہوئی۔ مگر یہ اعتراض صحیح نہیں؛ کیونکہ جہالت یہاں مندفع ہے؛ اس لیے کہ اُمِ ولد کا اضطراب ختم کرتے ہوئے امام ترمذی نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف کی اُمِ ولد ہے، لہٰذا اضطراب ختم ہوگیا۔ نیز جہالت کا بھی اعتراض وارد نہ ہوگا؛ کیونکہ یہ تو متحقق ہوگیا کہ یہ ابراہیم بن عبدالرحمٰن کی اُمِ ولد ہے، لہٰذا جہالت نہیں پائی گئی۔ حتیٰ کہ حافظ ابن حجرؒ نے ان کو تابعیہ قرار دیا ہے اور ان کا نام ''حمیدہ'' ذکر کیا ہے، لہٰذا ضعف کا حکم لگانا صحیح نہیں۔

۲۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: ''وأمشي في المكان القذر'' سے مراد وہ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جگہ ہے جہاں نجاستِ یابسہ پڑی ہوں اور اس صورت میں حکم یہ ہے کہ غسل واجب نہیں، یعنی اگر نجاستِ رطبہ نہ ہوں بلکہ نجاستِ یابسہ ہوں اور کپڑے اس سے مس کر جائیں تو وہ خود بخود زمین سے مَس ہو کر پاک ہو جاتے ہیں دھونا ضروری نہیں۔

۳۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے جواب علیٰ اسلوب الحکیم عنایت فرمائی ہے، سائلہ کو محض یہ شبہ ہوا کہ نجاست سے دامن ملوث ہو جاتے ہیں، کیونکہ گزرگاہ ایسے ہیں کہ وہاں نجاست پڑی ہوئی ہیں سو اگر چہ حقیقۃً کپڑے اور دامن پر نجاست لگتی نہیں مگر وہاں کی فضاء نجاست سے ملوّث ہونے کی وجہ سے کپڑے پر اثر انداز ہوگی، اسی وہم اور گمانِ محض کو دُور فرمانے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگے کی فضاء صاف ہے، نجاست سے ملی ہوئی نہیں ہے اس لیے وہ اپنا اثر چھوڑے گی اور نجاست کو دُور کر دے گی۔

۴۔ حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم کا ارشادِ عالی یہ ہے کہ سائلہ کا مقصد ان چھوٹے چھوٹے چھینٹوں کے متعلق سوال کرنا تھا جو عموماً راستہ پر ہوتے ہیں اور چلنے کی وجہ سے کپڑے پر پڑ جاتے ہیں۔

آپ ﷺ نے اس کے جواب میں تطہیر ارض کا حکم فرمایا۔ تا کہ شرح صدر اور بالکل اطمینان ہو جائے۔ علّامہ شامی نے ان چھینٹوں کے معاف ہونے کی صراحت فرمائی ہے۔

(محل امتحان نمبر:۲۹) ترک الوضوء مما مسّت النار

عن مالک عن زید بن أسلم عن عطاء بن یسار عن عبدالله بن عباس: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم أكل كتف شاةٍ ثم صلّى ولم يتوضأ.

(مؤطا امام مالک: ص:۸، مؤطا امام محمد: ص:۵۸)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

ممامست النار سے نقض وضوء اور عدمِ نقض کے بارے میں دورِ صحابہ میں اختلاف رہا ہے، مگر اب عدمِ نقض وضوء پر اجماع ہو چکا ہے۔ کما قالہ النووی۔ بہرحال پہلے اختلاف تھا، حضرت ابن عمرؓ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، انسؓ اور حضرت ابوایوبؓ نقض وضو کے قائل تھے۔ اور جمہور عدمِ نقض کے، ائمہ اربعہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ بلکہ پوری امت کا اب یہی مسلک ہے۔ کما قدمناہ آنفاً۔

اختلاف کے زمانہ میں قائلین نقض وضوء کا استدلال ان احادیث سے تھا جن میں ممامست النار سے وضوء کرنے کا حکم یا آپ ﷺ کا وضو کرنا ثابت ہو، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے: "توضءوا مما مست النار" اور جمہور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے استدلال فرماتے تھے: قال: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أکل کتف شاۃٍ ثم صلّی ولم یتوضأ۔

اور اس کے علاوہ بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ أکل مما مست النار ناقضِ وضوء نہیں۔

حضرت امام طحاویؒ فرماتے ہیں: کہ قبل الطبخ جس طرح ان کا کھانا جائز اور غیر ناقض تھا اسی طرح پکا دینے کے بعد بھی غیر ناقض رہے گا۔

جواب:

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کا جواب یہ ہے کہ وضوء کا حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت ہے قال: إن شئت فتوضأ وإن شئت فلا توضأ۔ (رواہ مسلم)

۲۔ في مصابيح السنة: والأحاديث كلّها منسوخ. یعنی أکل مما مست النار سے نقض وضوء کی روایات منسوخ ہیں۔

۳۔ وضوء سے وضوء شرعی نہیں، بلکہ لغوی یعنی ہاتھ منہ دھونا مراد ہے چنانچہ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے اور رسولِ خدا ﷺ نے کلی فرما کر نماز پڑھی اور وضوء کا اعادہ نہیں فرمایا۔ نیز شمائلِ ترمذی (ص:۱۲) کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وضوء سے لغوی وضوء مراد ہے۔ قال: بركة الطعام الوضوء قبله والوضوء بعده اور اس کے علاوہ دیگر جوابات دیے گئے ہیں۔

(والبسط في معارف السنن: ج:۱، ص:۲۸٦، أوجز: المسالک ص:۵٦)

(محل امتحان نمبر:۳۰) جامع الوضوء

عن مالک عن العلاء بن عبدالرحمٰن عن أبيه عن أبي هريرةؓ أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج إلى المقبرة۔ (مؤطا امام مالک: ص۹/۸)

حدیث پاک کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور پاک ﷺ قبرستان گئے اور سلام کرتے ہوئے فرمایا کہ ان شاء اللہ میں بھی تم لوگوں سے مل جاؤں گا۔ مجھ کو آرزو ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھوں۔ اس پر صحابہ کو اشکال ہوا کہ آپ ﷺ ہم کو بھائی نہیں کہتے ہیں اور ان لوگوں کو بھائی فرما رہے ہیں۔ صحابہؓ نے سوال کیا ”ألسنا بإخوانک“ فقال: آپ نے فرمایا: ”بل أنتم اصحابي“. کہ تم تو میرے ساتھی ہو۔ ”وأصحابنا الذين لم ياتوا بعد“. اور میرے بھائی تو وہ ہیں جو بعد میں آئیں گے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمام لوگوں سے پہلے حوضِ کوثر پر موجود رہوں گا۔ اور جو بھی میرے پاس آئیں گے میں ان کو پہچان لوں گا۔ صحابہؓ نے سوال کیا کہ آپ کیسے پہچان سکیں گے جبکہ آپ کی امت تا قیامت آتی رہے گی؟ فرمایا کہ آثار وضوء سے پہچان لوں گا۔ پھر بدعتی کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ بھی میرے قریب آئیں گے اور میں بھی چاہوں گا کہ آجائیں مگر انہیں روک دیا جائے گا اور اس کی وجہ مجھ کو بتلا دی جائے گی کہ انہوں نے دین میں نئی نئی باتیں پیدا کی ہیں۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

"إنا إن شاء الله بكم لاحقون"

اِس جملہ پر اعتراض ہوتا ہے کہ موت امر یقینی ہے، پھر مشیتِ الٰہی پر موقوف کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جواب: ۱۔ أنه عليه السلام علق على مشيته تبركًا باسمه عز وجل.

۲۔ معناه: إنا إن شاء الله لاحقون بكم في هذه المقبرة . یعنی تدفین کو مشیت پر معلق کیا۔

۳۔ وقيل معناه: إنا لاحقون بكم في حال الإيمان إن شاء الله تعالى.

۴۔ أنه عليه السلام استثنى المنافقين. أي إنا إن شاء الله بكم لاحقون يا أيها المسلمون المخلصون ولستُ بلاحقين بالمنافقين.

"قوله: ألسنا بأخوانک الخ"

صحابہ کرامؓ نے حضور پاک ﷺ کے ارشاد پاک "وددت إني قد رأيت إخواننا" پر حضور ﷺ سے عرض کیا "ألسنا بأخوانک" آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا: بل أنتم أصحابي. آپ کے اس ارشاد سے اخوت کی نفی نہیں ہورہی ہے، بلکہ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میری اخوت کا تعلق عام ہے۔ صحابہ، غیر صحابہ (تابعین وغیرہم) سب کو شامل ہے، لہٰذا حضرات صحابہؓ تو ہمارے اخوان میں شامل ہیں ہی، مزید ان کو ایک فضیلت حاصل ہے اور وہ فضیلت صحابیت ہے، فالمعنی: انكم أخواني أيضا ولكم فضيلة مزيدة على الأخوة وهي الصحبة ومن ياتي بعد، فلهم الأخوة فقط لا الصحبة فإنا أخوهم ولست صاحبهم وأما أنتم فأخواني وأصحابي جميعًا.

حدیث پاک میں امتِ محمدیہ کی علامت غرۃ التحجیلین بیان کی گئی ہے۔ امام مالکؒ نے جامع الوضوء کے تحت اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ اس لیے یہاں تطویل غرہ اور تطویل تحجیل کی بحث مناسب ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

تطویل غرۃ: وھو غسل شيءٍ من مقدم رأسه ومایجاوز الوجه زائدۃً علی الجزء الذي یجب غسله لإستیقان کمال الوجه.

تطویل تحجیل: ھو غسل مافوق المرفقین والکعبین.

علماء احناف نے تطویل تحجیل کو مستحب قرار دیا ہے۔ مگر قدر استحباب میں اختلاف ہے۔

فقال البعض: الغسل فوق المرفقین والکعبین من غیر تعیینٍ.

وقال البعض: إلی نصف العضد والساق. وقیل: إلی المنکبین والإبطین.

ابن بطال مالکی نے فرمایا کہ: علماء کا اتفاق ہے کہ فوق المرفقین والکعبین زیادتی فی الغسل مستحب نہیں، مگر یہ نقل بالاتفاق غلط ہے، لأنه قد ثبت عنه علیه السلام فعلُ ذٰلک وکذا عن أبي ھریرۃ. (کما في حدیث النسائي)

والتفصیل في ''الفیض السمائي علی سنن النسائي'' (ج:۱، ص:۱۱۴)

(محل امتحان نمبر:۲۱) الوضوء ممّا تشرب منه السباع وتلغ منه

ان عمر ابن الخطاب خرج في رکب. فقال عمرو بن العاص: یاصاحب الحوض! ھل ترد حوضک السباعُ؟ فقال عمر بن الخطاب: یاصاحب الحوض! لاتخبرنا. فإنا نرد علی السباع وتردُ علینا. (مؤطا امام محمد: ص:۶۶)

حدیث پاک میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور عمر بن الخطابؓ کا واقعہ ہے کہ یہ دونوں قافلہ کے ساتھ تھے، ایک جگہ انہوں نے حوض دیکھا، پانی کی ضرورت تھی حوض کے قریب پہنچے، حضرت عمرو بن العاصؓ نے صاحبِ حوض سے پوچھا کہ: درندے تمہارے حوض سے پانی پینے آتے ہیں؟ ابھی صاحبِ حوض نے جواب نہیں دیا تھا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا کہ تم اس کی خبر نہ دو؛ کیونکہ ہم ان پر آتے ہیں اور وہ ہم پر آتے ہیں۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

سؤرِ سباع میں ائمہ کا اختلاف

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خنزیر اور کلب کے علاوہ تمام سباع کا سور طاہر ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: کہ تمام سباع کا سور پاک ہے اور عند الاحناف سؤر السباع کلها نجس.

في البدائع: وأما السور المختلف في طهارته ونجاسته فهو سؤر الخنزير والكلب وسائر سباع الوحش؛ فإنه نجس عند عامة العلماء، وقال مالك: طاهر، وقال الشافعي: سؤر السباع كلها طاهر سوى الكلب والخنزير. (بدائع الصنائع: ج:۱، ص:۲۰۲)

دلائل:

امام شافعیؒ کا استدلال حضرت جابرؓ کی روایت سے ہے: قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم أنتوضأ بماأفضلت الحمر؟ قال: نعم. وماأفضلت السباع كلها.

امام مالکؒ فرماتے ہیں: اللہ پاک کا ارشاد ہے: هو الذي خلق لكم مّافي الأرض جميعًا.

وجہِ استدلال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام مخلوقات سے انتفاع کو مباح قرار دیا ہے اور انتفاع کی اباحت، طاہر ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی انتفاع توشیٔ طاہر ہی سے ہوگا۔ معلوم ہوا کہ تمام سباع کا سور بھی پاک ہے؛ نیز فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کے کھانے کو حرام قرار دیا ہے، مگر حرمت اکل نجاست پر دلیل نہیں، جیسا کہ آدمی کا کھانا حرام ہے، مگر اس کی وجہ سے آدمی کو نجس نہیں کہا جاسکتا ہے۔

اب رہی بات کہ جب سور سباع حلال وطاہر ہیں تو پھر ولوغ کلب سے غسل اناء کا حکم کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ امر تعبدی ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: سؤر السباع كلها نجس. ولنا ماروی عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: إذا ولغ الكلب في إناء أحدكم فاغسلوه ثلاثا. وفي رواية ''خمسًا'' وفي رواية ''سبعًا''. (دارقطنی:ج:۱،ص:۶۵،۶۶)

آپ ﷺ نے ولوغ کلب فی الاناء کی صورت میں غسل اناء کا حکم دیا ہے اور امر بالغسل نجاست کی وجہ سے ہے؛ کیونکہ یہ امر تعبدی نہیں ہوسکتا؛ اس لیے کہ امر تعبدی میں مقصود قرابت ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ غسل اناء میں قرابت نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی دوبارہ اس کو استعمال میں نہ لانا چاہے تو اس کا دھونا بھی ضروری نہیں، فعلم أنه لنجاسته. (البدائع: ج:۱، ص:۲۰۳)

علّامہ کاسانی صاحبِ بدائع الصنائع فرماتے ہیں: لأن سؤر هٰذه الحيوانات متحلب من لحومها ولحومها نجسةٌ. ويمكن التحرز عن سورها. و صيانة الأواني عنها فيكون نجسًا ضرورة. (البدائع: ج:۱، ص:۲۰۳)

یعنی سؤر کا تعلق گوشت سے ہے اور ان حیوانات کا گوشت نجس ہے، لہٰذا ان کا سؤر بھی نجس ہوگا اور یہ اشکال نہ کیا جائے کہ بلی کے سؤر کا بھی تعلق گوشت ہی سے ہے، لہٰذا اس کے سؤر کو بھی نجس کہنا چاہیے؛ کیونکہ وہاں صیانت مشکل ہے؛ کیونکہ اس کی آمدورفت زیادہ ہوتی ہے، لہٰذا اس میں خفت آگئی، برخلاف دیگر سباع بہائم کے، کہ اس سے صیانت اور برتن کو محفوظ رکھنا امرِ مشکل نہیں اور جب اس سے بچنا ممکن ہے تو نجاست بھی ضرورۃً ثابت ہوگی۔

جواب:

(۱) امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ ''حدیث جابرؓ'' منقطع ہے؛ کیونکہ داؤد بن حصین کا حضرت جابرؓ سے لقاء ثابت نہیں۔ نیز داؤد بن حصین کو ابن حبان نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (المرقات: ج:۲، ص:۶۲)

۲۔ یہ حکم تحریم سؤر سباع سے پہلے کا ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(محل امتحان نمبر:۳۲) ماجاء في المسح بالرأس والأذنين

عن مالک عن نافع أن عبدالله بن عمر كان يأخذ الماء بإصبعيه لأذنيه. (مؤطا امام مالک: ص:۱۱)

حضرت امام مالکؒ نافعؒ سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ اپنے کانوں کے لیے پانی لیتے تھے، یعنی کان پر مسح کرنے کے لیے الگ سے پانی لیتے تھے۔

اُذنین کے لیے ماءِ جدید مسنون ہے یا کہ ماءِ راس ہی سے اُذنین کا بھی مسح کیا جائے؟ اس بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر اُذن (کان) کے لیے مستقلاً ماءِ جدید لینا مسنون ہے؛ کیونکہ یہ دونوں الگ الگ دو عضو ہیں اور رأس میں نہ تو حقیقۃً داخل ہیں اور نہ ہی حکماً۔ حقیقۃً تو اس لیے داخل نہیں کہ رأس کہتے ہیں منبتِ شعر کو اور کان پر بال نہیں ہوتے، لہٰذا حقیقی معنیٰ مفقود ہونے کی وجہ سے رأس میں داخل نہیں۔ اسی طرح حکماً بھی رأس میں داخل نہیں؛ کیونکہ اگر حکماً رأس ہوتے تو اُذنین پر مسح کرنا مسحِ رأس کے قائم مقام ہونا چاہیے، حالانکہ ایسی بات نہیں۔ وإن ليس فليس. (كما في البدائع: ج:۱، ص:۱۱۶)

احناف وحنابلہ: فرماتے ہیں کہ اذنان رأس میں داخل ہیں، لہٰذا مسنون یہی ہے کہ رأس کے بچے ہوئے پانی سے ہی ان کا مسح کیا جائے، الگ سے پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی مسلک سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن المبارکؒ کا ہے، امام مالکؒ کی بھی یہی ایک روایت ہے۔ (کمافی المرقات: ج:۲، ص:۲۴)

دلائل:

امام شافعیؒ کا استدلال حدیث نافع عن ابن عمر سے ہے یعنی حدیث الباب سے:

۱۔ عن عبد الله بن عمر كان يأخذ الماء بإصبعيه لأذنيه.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

۲۔ دوسری دلیل معجم طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت انسؓ رسولِ خدا ﷺ کے مسح کی کیفیت بیان فرماتے ہیں: وأخذ لصماخيه فمسح صماخيه ماءً جديداً.

(معارف السنن: ج:۱، ص:۱۸۳)

جواب:

امام شافعیؒ نے جو روایت استدلال میں پیش کیا ہے اس کا احناف کے متدلات سے تعارض معلوم ہوتا ہے، لہٰذا توفیقاً بین الاحادیث اس کی تاویل کی جائے گی اور وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یا حضرت ابن عمرؓ نے جو ماءِ جدید کا استعمال فرمایا ہے وہ اس وقت تھا جبکہ ماءِ رأس خشک ہو چکا تھا اور ہمارا بھی مسلک یہی ہے کہ اگر پانی (رأس کے بچے ہوئے پانی) خشک ہوجائیں تو ماءِ جدید لینا چاہیے: ففي المرقات: قال ابن الهمام: أما ماروى أنه أخذ ماءً جديداً فمحمول على أنه لفناء البلة قبل الإستيعاب. توفيقًا بينه وبين ماذكرنا. (المرقات: ج:۲، ص:۲۴)

(محل امتحان نمبر:۳۳) المسح على العمامة

عن مالک أنه بلغهٗ أن جابر الأنصاري سئل عن المسح على العمامة. فقال: لا، حتى يمسح الشعر بالماء. (مؤطا امام مالک: ص:۱۱)

العمامة ''پگڑی'' خمار، اور اوڑھنی، کے معنیٰ میں مستعمل ہے، لأن المرأة كما تعطي بها رأسها كذا الرجل يعطي بها رأسهٗ. یعنی مقصود ایک ہی ہے۔ عورت اپنے سر کو اوڑھنی کے ذریعہ ڈھانک لیتی ہے تو مرد بھی اپنے سر کو پگڑی کے ذریعہ ڈھانک لیتا ہے۔

اختلاف:

مسح علی العمامۃ جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

امام احمدؒ: فرماتے ہیں کہ مسح علی العمامۃ کافی ہے یعنی اگر کوئی سر پر مسح نہ کرے اور صرف عمامہ پر مسح کرے تو یہ جائز ہے؛ مگر شرط یہ ہے کہ طہارتِ کاملہ پر عمامہ باندھا ہو، جیسا کہ مسح علی الخفین جائز ہے بشرط اللبس علی طهر کامل.

امام شافعیؒ: فرماتے ہیں کہ عمامہ پر مسح کرنے سے سنت استیعاب ادا ہو جائے گی یعنی اگر صرف عمامہ پر مسح کرے اور سر پہ مسح نہ کرے تو فرضیتِ مسح ادا نہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ أدنیٰ مایطلق علیه اسم المسح پر مسح کر لینے کے بعد عمامہ پر مسح کرنا جائز ہے۔

امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ: مطلقاً مسح علی العمامہ جائز نہیں، وهو مروي عن علي رضي الله عنه وابن عمر رضي الله عنه وغيرهم.

دلائل:

امام احمدؒ کا استدلال حدیثِ مغیرہؓ سے ہے: أنه عليه السلام مسح على الخفين ومقدم رأسه وعلى عمامته. (مسلم شریف: ج:۱، ص:۱۳۴)

حضرت امام اعظمؒ کا استدلال: اللہ پاک کے ارشاد سے ہے: قال الله عز وجلّ: ''وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ''.

خدا تعالیٰ نے سر کے مسح کا حکم فرمایا ہے۔ اور عمامہ، رأس (سر) نہیں ہے۔

نیز مسح علی الرأس کے بارے میں آثار متواترہ وارد ہوئے ہیں۔ فلا یترک.

جواب:

۱۔ امام احمدؒ کی دلیل ''حدیثِ مغیرہؓ'' کا جواب یہ ہے کہ اس میں اس بات کا امکان ہے کہ آپ نے تو مسح علی الرأس ہی فرمایا ہو پھر عمامہ درست فرمایا ہو اور راوی نے سمجھا کہ آپ نے عمامہ پر مسح کیا ہے، فروی مافهم. یعنی انہوں نے جو سمجھا ویسی ہی روایت کر دی۔ (کمافی المرقات: ج:۲، ص:۱۶)

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

۲۔ حدیثِ مغیرہؓ میں ہے: ''ومقدم رأسه وعلى عمامته'' مقدم رأس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً آپ نے مقدار مفروض یعنی ناصیہ پر مسح فرمایا، لہٰذا مسح علی العمامہ کو کافی کہنا صحیح نہیں۔

۳۔ والأحاديث كلها معلولة. كذا في الإستذكار. (التعليق: ج:۱، ص:۲۰۹)

۴۔ پہلے مسح علی العمامہ کا جواز رہا ہو پھر منسوخ ہوگیا جیسا کہ امام محمدؒ نے فرمایا:

بلغنا: أن المسح على العمامة كان، فترك.

۵۔ مسح علی العمامہ کی روایت خبر واحد ہے اور کتاب وآثار متواترہ میں اس کا جواز نہیں ملتا، لہٰذا خبر واحد سے کتاب وآثار متواترہ پر زیادتی صحیح نہیں۔

۶۔ آپ ﷺ کا مقصد ''مسح على الرأس'' ہی تھا مگر آپ کے عمامہ کے باریک ہونے اور پانی کے اندر جذب ہوجانے کی وجہ سے اوپر سے ہی مقصود حاصل ہورہا تھا اس لیے آپ نے عمامہ پر ہی مسح کیا اور آپ کا مقصود بھی حاصل ہوگیا۔ اس تاویل سے تمام روایات میں توفیق کی صورت ہوجاتی ہے۔

(محل امتحان نمبر:۳۴) ما جاء في المسح على الخفين

عن المغيرة بن شعبة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ذهب لحاجته الخ. وفيه: فغسل يديه ومسح برأسه ومسح على الخفين.

(مؤطا امام مالک: ص:۱۲، امام محمد: ص:۶۶)

یہاں دو مسئلے ہیں:

(۱)۔ ثبوت مسح علی الخفین۔ (۲)۔ مدتِ مسح یعنی توقیت فی المسح۔

المسئلة الاولى ثبوت مسح على الخفين:

پوری امت کا اجماع ہے کہ مسح علی الخفین مشروع ہے اور ہونا بھی چاہیے؛ کیونکہ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

بہت سارے صحابہ کرامؓ سے اس بارے میں روایات آئی ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک چڑھتے سورج کی طرح مجھے یقین نہ ہوا، میں اس کا قائل نہ ہوا، یعنی یہ مسئلہ مثل ضوءِ شمس بالکل ہی ظاہر و عیاں ہے، یہاں تک کہ اس پر اعتقاد شعائرِ اسلام میں سے ہے۔

منکرینِ جوازِ مسح علی الخفین:

خوارج و روافض اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے اس کی اجازت تھی پھر آیت مائدہ سے اس کی اجازت منسوخ ہوگئی، فقال الخوارج: المسح على الخفين ليس بشئ ولاثبوت له؛ لأن عليًا قال إذا سئل عن المسح على الخفين: ''سبق الكتاب الخفين. فعلم أنه منسوخ بآية المائدة وبه قالت الفرقة الإمامية. (معارف السنن: ج:۱، ص:۳۲۱، ۳۲۲)

جواب:

۱۔ قال ابن عبدالبر: لاأعلم رُويَ عن أحدٍ من فقهاء السلف إنكارهُ. (معارف السنن: ج:۱، ص:۳۲۱)

معلوم ہوا کہ جوازِ مسح علی الخفین پر اجماع منعقد ہوگیا ہے اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بیشتر صحابہ کرامؓ سے روایات منقول ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس کا انکار خوارج و روافض اور فرقۂ امامیہ ہی کرتے ہیں جو مخالفِ اجماع نہیں ہے اور ان کا شمار بھی ان لوگوں میں نہیں ہے جن کے انکار سے اجماع میں خلل واقع ہو۔

۲۔ حضرت علیؓ کے قول ''سبق الكتاب الخفين'' سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ قول حضرت علیؓ سے بہ سندِ صحیح متصل منقول نہیں ہے اور اس کے برخلاف بہ سندِ متصل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے: أنها قالت لشريح بن هاني: عليك

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

بإبن أبي طالب، چنانچہ وہ حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسح علی الخفین کے بارے میں دریافت فرمایا، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا: ثلاثة أيام ولياليها للمسافر ويوم وليلةٌ للمقيم. (كذا في هامش هدايه: ج:۱، ص:۵۷، حاشيه:۱۹) فيختار ماهو المروی متصلاً.

جواب:

مسح علی الخفین کی روایات متواتر أواردہوئی ہیں، فالزيادة بها على الكتاب جائزة.

نیز وَأَرْجُلَكُمْ میں بفتح اللام وبکسر ہا دونوں روایت ہیں اور کسرہ ہونے کی صورت میں مسح، آیت کے مخالف نہیں ہے۔

المسئلة الثانية: التوقيت في المسح:

امام مالکؒ عدمِ توقیت کے قائل ہیں۔ جمہور کے یہاں مسح علی الخفین موقت ہے، فقالوا: ثلاثة أيام ولياليهن للمسافر ويوم وليلة للمقيم.

(معارف السنن: ج:۱، ص:۳۳۵، البدائع: ج:۱، ص:۷۸)

دلائل:

حضرت امام مالکؒ عدمِ توقیت فی المسح علی الخفین پر حضرت أبي ابن عمارہ کی روایت سے استدلال فرماتے ہیں: أنه قال: ۱۔ یارسول اللہ! أمسح على الخفين؟ فقال: نعم. قال: يومًا؟ قال: نعم. قال: يومين؟ قال: نعم. حتى بلغ سبعًا قال: نعم ومابدألك. (ابوداؤد: ج:۱، ص:۲۱)

۲۔ عن عقبة بن عامر أنه قدم على عمر بفتح دمشق وعليه خفان. فقال لي عمر: كم لك ياعقبة لم ينزع خفيك؟ فتذكرت من الجمعة إلى الجمعة، فقلت: منذ ثمانية أيام. فقال: أحسنت وأصبت السنة.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جمہور کی دلیل حضرت شُریح بن ہانی کی روایت ہے: قال: سئلت علی بن أبي طالب عن المسح علی الخفين؟ فقال: جعل رسول الله صلی الله عليه وسلم ثلاثة أيام ولياليهن للمسافر ويوم وليلة للمقيم. (مسلم شریف: ج:۱، ص:۱۳۵)

الجواب عن استدلال الإمام مالک:

۱۔ جس حدیث سے امام مالکؒ کا استدلال ہے اسے امام ابوداؤد نے ذکر کیا ہے، وقال: ''وقد اختلف في اسنادہٖ وليس هو بالقوي'' (ابوداؤد: ج:۱، ص:۲۱)

۲۔ ابی ابن عمارہ کی حدیث ضعیف ہے۔ وأما رواية شريح بن هاني، فهي مشهورة. (البدائع: ج:۱، ص:۷۹)

ولنا الحديث المشهور، وماروي أنه مسح وبلغ بالمسح سبعًا فهو غريبٌ. فلايترک به المشهور، مع ان الرواية المتفق عليها أنه بلغ بالمسح ثلاثًا.

۳۔ جن روایات میں آیا ہے ''حتی بلغ سبعًا''. یعنی سات دن مسح کرنے کا ذکر ہے اس کی تاویل یہ ہے کہ مدتِ مسح میں سات مرتبہ مسح کی حاجت پیش آئی۔

وتاويله: أنه احتاج إلی المسح سبعًا في مدة المسح. (البدائع: ج:۱، ص:۷۹)

دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر نے حضرت عمر فاروقؓ کا قول ذکر فرمایا ہے: ''أحسنت وأصبت السنة'' جبکہ توقیت فی المسح کے سلسلہ میں حضرت فاروق اعظمؓ سے صریح روایت ہے: قد روی جابر الجعفي عن عمر، أنه قال: للمسافر ثلاثة أيام، وللمقيم يوم وليلة. (البدائع: ج:۱، ص:۷۹)

نیز امام طحاویؒ نے بھی حضرت عمرؓ سے ایسی ہی روایت نقل فرمائی ہے: فقال: للمسافر ثلاثة أيام ولياليهن وللمقيم يوم وليلةٌ. (الطحاوي: ج:۱، ص:۵۰)

اور یہ روایات خبر مشہور کے مطابق ہیں، لہٰذا ان ہی کو اختیار کیا جائے گا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اب رہی بات یہ کہ جہاں حضرت عمرؓ سے یہ روایات منقول ہیں وہیں حضرت عقبہ بن عامر بھی ان ہی کا قول ذکر فرما رہے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے قول ''أحسنت وأصبت السنة'' کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ مسح میں توقیت نہیں ورنہ تعارض لازم آئے گا، واقعہ یوں ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کو معلوم تھا کہ جس راستہ سے حضرت عقبہ بن عامر آئے ہیں اس راستہ میں پانی کی سہولت مہیا نہیں ہے، لوگ بمشکل بھی پانی پر قادر نہیں ہو پاتے ہیں تو ایسی صورت میں تیمم کا حکم ہے اور تیمم میں پاؤں سے کچھ لینا دینا ہے ہی نہیں، لہٰذا خواہ خفین پہنے ہوں یا نہ پہنے ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا، اب حضرت عمرؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے پانی نہ پایا تو تم پر خفین نکالنا ضروری بھی نہ تھا بلکہ محض تیمم ہی کافی تھا اب جب کہ تم نے بغیر خفین نکالے ہوئے تیمم کر لیا تو گویا تم نے حق (یعنی جواز تیمم) کو پالیا کیونکہ ایسی صورت میں تیمم کا حکم ہے فمعناه: إن قد أحسنت حيث تيممت وأصبت السنة حين ماتيممت لفقدك الماء.

(محل امتحان نمبر:۳۵) العمل في المسح على الخفين

عن مالك عن هشام بن عروة أنهٗ رأى أباه يمسح على الخفين وكان لايزيد إذا مسح على الخفين على ان يمسح ظهورهما ولايمسح بطونهما. (مؤطا امام مالک: ص:۱۳)

مسح کی پانچ صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱)۔ ظاہر خف اور اعلیٰ خف پر مسح کیا جائے۔

(۲)۔ اسفل خف پر مسح کیا جائے۔

(۳)۔ الإكتفاء على المسح على أعلى الخف.

(۴)۔ الإكتفاء على اسفل الخف.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

(۵)۔ الجمع بين الأعلى والأسفل.

ظاہر خف اور اعلیٰ خف پر بالاتفاق مسح کرنا فرض ہے، لہٰذا صرف اعلیٰ خف پر مسح کرے تو جائز اور بالاتفاق اسفل خف پر اکتفاء جائز نہیں۔ دونوں کو جمع کرنا کیسا ہے؟ تو اس سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ و مالکؒ: فرماتے ہیں کہ اسفل خف پر مسح کرنا مستحب ہے۔

احناف و جمہور فقہاء: ان کے یہاں مسح علی اسفل الخف مسنون و مستحب نہیں ہے۔

دلائل:

امام مالکؒ و شافعیؒ کی دلیل حدیث مغیرہؓ ہے قال: توضّأ النبي صلى الله عليه وسلم في غزوة تبوك، فمسح أعلى الخف وأسفله. (ترمذي: ج:۱، ص:۲۸)

جمہور:

۱۔ عن المغيرة قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمسح على الخفين على ظاهرهما. (ترمذي: ج:۱، ص:۲۹)

۲۔ وعن علي رضي الله عنه قال: لوكان الدين بالرأي لكان أسفل الخف أولى بالمسح من أعلاهٗ ولقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمسح على ظاهر خفيه. (ابوداؤد شريف: ج:۱، ص:۲۲)

۳۔ حضرت عروہ کا عمل، جو باب کے تحت حضرت ہشام بن عروہ سے مروی ہے وہ بھی جمہور کی دلیل ہے۔

الجواب:

جس روایت سے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے امام ترمذیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں: ''معلول'' لہٰذا حدیث معلول سے استدلال تام نہیں ہوگا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

مزید یہ کہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کے متعلق ابوزرعہؒ اور حضرت امام بخاریؒ سے پوچھا، فقالا: ليس بصحيح. (ترمذی: ج:۱، ص:۲۸)

نیز حضرت مغیرہ سے متعدد طرق سے بہت ساری روایات ہیں جو مسح خف کے متعلق ہیں کسی میں بھی مسح علیٰ اسفل خف کا ذکر نہیں، صرف یہی ایک روایت میں اس کا ذکر ہے، لہٰذا یہ روایت شاذ ہوئی، جو قابلِ حجت نہیں۔

(محل امتحان نمبر:۳٦) الوضوء من المذي

عن مالك عن أبي النضر مولى عمر بن عبيد عن سليمان بن يسار عن المقداد بن الأسود: أن علي بن أبي طالب أمرهٗ أن يسئل لهٗ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الرجل إذا دنا من أهله فخرج منه المذي ماذا عليه؟ قال علي: فإن عندي إبنة رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا أستحي أن أسئلهٗ. قال المقداد: فسألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذٰلك، فقال: إذا وجد ذٰلك أحد فلينضح فرجهٗ بالماء وليتوضأ وضوءه للصلوٰة. (مؤطا امام مالک: ص:۱۴)

یہاں پر تین بحثیں ہیں:

(۱)۔ مذی کا غسل ضروری ہے یا صرف نضح کافی ہے۔

(۲)۔ محل نجاست کا غسل کیا جائے یا پورے اعضاء کا؟

(۳)۔ رفع تعارض۔

البحث الأول:

حضرت امام مالکؒ، شافعیؒ اور جمہور فقہاء کا اس سلسلہ میں مذہب یہ ہے کہ اگر مذی

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

کپڑے یا بدن پر لگ جائے تو اس کا غسل ضروری ہے، نضح کافی نہیں۔

امام أحمدؒ: وعن الإمام احمد فيه قولان: (۱)الغسل ضروری (۲)النضح کافٍ. وهٰذا هو الراجح من مذهبه وبه أخذ الشوكاني ويؤيد بقوله عليه السلام: ''فلينضح فرجهٗ''

یعنی امام شوکانی نے امام احمدؒ کے قول کی تائید میں کہا کہ نضح کافی ہے اور حضور پاک ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے: ''فلينضح فرجهٗ'' چونکہ آپ نے نضح کو کافی قرار دیا اس لیے غسل ضروری نہیں ہوگا۔

مگر یہ استدلال درست نہیں؛ کیونکہ نضح، غسل کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، کما فی حدیث المستحاضۃ، لہٰذا لفظ نضح کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ غسل واجب نہ ہو، جبکہ دیگر احادیث میں اس کی صراحت ہے۔

البحث الثاني:

صرف محل نجاست کو دھونا ضروری ہے یا پورے اعضاء کا غسل ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام مالکؒ واحمدؒ: پورے اعضاء کا غسل ضروری ہے، اِلّا یہ کہ امام مالکؒ صرف غسلِ ذکر کو کافی کہتے ہیں اور امام احمدؒ غسل ذکر مع الانثیین کے قائل ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ وشافعیؒ: صرف موضعِ نجاست کا غسل ضروری ہے، یعنی جتنی جگہ نجاست لگی ہوئی ہو اگر دھولیا تو پاکی حاصل ہوجائے گی؛ لہٰذا اگر پورے أعضاء پر مذی لگ جائے تو پورے اعضاء کا غسل ضروری ہے، ويؤيد ذٰلك ماعند الإسمٰعيلي في رواية: ''توضأ واغسلهٗ'' آپ نے بہ صیغۂ مفرد غسل کا حکم فرمایا ہے، معلوم ہوا کہ صرف موضعِ نجاست کا غسل ضروری ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

اعتراض:

اس روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غسل انثیین ضروری نہیں، مگر یہ کہاں لازم آیا کہ صرف موضع نجاست کا دھونا ضروری ہے، البتہ غسل ذکر کا ثبوت ہوتا ہے؛ کیونکہ بہ صیغۂ مفرد اس کا حکم ہے۔

جواب:

یہاں غسل سے موضعِ نجاست کا غسل مراد ہے؛ کیونکہ دیگر نواقضِ وضوء مثلاً پیشاب و پائخانہ وغیرہ اگر کپڑے پر لگ جائیں تو اس صورت میں حکم پورے کپڑے یا پورے بدن کے دھونے کا نہیں، اسی طرح جب مذی جو کہ نواقضِ وضو میں سے ہے اس میں بھی حکم یہی ہوگا کہ جہاں نجاست (مذی) لگی ہو اس کا دھونا ضروری ہے، لہٰذا اگر پورے ذکر کا پر مذی لگی ہو تو ذکر کے ساتھ خصیتین کا بھی دھونا ضروری ہوگا۔

جواب:

(۱)۔ جن احادیث میں غسل ذکر مع الانثیین کا ذکر ہے جس سے امام احمدؒ نے استدلال کیا ہے وہ امرِ استحبابی پر محمول ہے، یعنی سب کا دھونا ضروری نہیں بلکہ بہتر ہے۔

(۲)۔ آپ ﷺ نے قطراتِ مذی کو ختم کرنے کے لیے یہ حکم فرمایا ہے، یعنی یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ بطورِ علاج ہے، كما في الحديث المستحاضة: "فإنها تغسل وتجلس في المراكن". (عن الطحاوي كما في الفيض الباري)

البحث الثالث: "رفع تعارض"

تعارض یہ ہے کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت علیؓ نے خود ہی جناب رسول کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت فرمایا اور کسی روایت میں حضرت مقداد، تو کسی میں حضرت عمار کے

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

سوال کرنے کا تذکرہ ہے، كما في رواية أبي داؤد: ''ان عليا أمر عمارًا'' وفي النسائي: ''عن علي قال: قلت للمقداد'' وكذا في رواية الموطا للإمام مالك.

رفعِ تعارض:

رفعِ تعارض کی شکل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عمار اور حضرت مقداد دونوں کو دریافت مسئلہ کے لیے کہا ہو، پھر شدتِ احتیاج کی وجہ سے خود ہی مسئلہ دریافت فرمالیا اور بعد میں ان دونوں نے اجتماعاً یا انفراداً حضور پاک ﷺ سے مسئلہ معلوم کر کے حضرت علیؓ کو بتلایا، لہٰذا ہر طرح کی روایات آ گئیں۔

علّامہ نوویؒ فرماتے ہیں: ''سوال کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف مجازاً ہے'' ''لان الأمر هو علي كرم الله وجهه. فلا تعارض''.

(محلِ امتحان نمبر: ۳۷) الوضوء من مسّ الفرج

عن مالك عن عبدالله بن أبي بكر بن عمرو بن حزم أنه سمع عروة بن الزبير يقول: دخلت على مروان بن الحكم فتذاكرنا مايكون منه الوضوء، فقال مروان: ومن مسّ الذكر الوضو. فقال عروة: ماعلمت ذلك، فقال مروان: أخبرتني بسرة بنت صفوان أنها سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إذا مَسَّ أحدكم ذكره فليتوضأ.

محدثین وفقہاء کرام کا اس باب میں زبردست اختلاف ہے کہ مسِّ ذکر موجبِ وضوء ہے یا نہیں؟ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ناقضِ وضوء اور موجب وضوء نہیں ہے، وكذا الحكم في مسّ الفرج والدبر. یعنی مسِّ فرج یا مسِّ دُبر سے بھی وضوء نہیں ٹوٹے گا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مسِ ذکر ناقض وضوء ہے إن کان بباطن الکف بلا حائل. یعنی شرط یہ ہے کہ مس بلا حائل اور باطن کف سے ہو، اسی طرح مسِ فرج اور مسِ دُبر بھی ان کے یہاں ناقض ہے۔

حضرت امام مالکؒ اور امام احمدؒ سے دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔

(۱)۔ مسِ ذکر ناقض نہیں کما هو مذهب الأحناف، صرح به ابن خزيمة في صحيحه.

(۲)۔ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق۔ معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ ناقضِ وضو اور موجبِ وضو کے قائل ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ موجبِ وضو کے قائل نہیں ہیں۔

دلائل:

امام شافعیؒ کا استدلال حضرت بسرہ بنت صفوان کی روایت سے ہے: (یعنی حدیث الباب سے) ان کی روایت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسِ ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور باطن کف کی قید لگانے میں انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے: قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أفضى بيده الى ذكره ليس دونهٗ ستر فقد وجب عليه الوضوء. (مجمع الزوائد: ج:۱، ص:۲۴۹)

اور مسِ فرج سے نقضِ وضو کا حکم لگانے کے لیے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت کا سہارا لیا ہے: قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من مسّ فرجهٗ فليتوضأ. وأيُّما إمرأة مسّتْ فرجها فلتتوضأ.

(كما في مجمع الزوائد: ج:۱، ص:۲۴۵)

حاصل یہ کہ امام شافعیؒ نے حضرت بسرہ کی روایت کو مدار ٹھہراتے ہوئے مسئلہ کی بنیاد ڈالی ہے اور ان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسِ ذکر ناقضِ وضوء ہے اور فرج و دبر بھی ذکر کے حکم میں داخل ہے اس لیے اس سے بھی وضوء واجب ہوگا۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

احناف، حضرت طلق بن علیؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں: عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: هل هو إلا مضغه منه أو بضعة منه.

(الترمذي: ج:۱، ص:۲۵)

وعن طلق بن علي رضي اللّٰه عنه قال: قال رجل: مسستُ ذکري (أوقال) الرجل یَمسُّ ذکره في الصلوٰة أعلیه الوضوء؟ فقال النبي صلی اللّٰه علیه وسلم: لا، إنما هو بُضعة منک. (إعلاء السنن: ج:۱، ص:۱۹۰)

اعتراض:

دلیل احناف پر شافعیہ نے اعتراض کیا ہے اور ضعف کا حکم لگایا ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ روایت ایوب بن عتبہ اور محمد بن جابر سے مروی ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کا مدار قیس بن طلق پر ہے اور یہ بھی ضعیف ہیں۔

جواب:

ضعف کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے؛ کیونکہ جہاں ایوب بن عتبہ اور محمد بن جابر کے ضعف کا اعتراض ہے، تو ان کا ضعف روایت کے لیے مضر نہیں؛ کیونکہ (موارد الظمآن: ج:۱، ص:۷۷) پر اس کا متابع موجود ہے۔ نیز ان کے علاوہ ملازم بن عمر اور عبداللہ بن بدر سے بھی یہ روایت منقول ہے، لہٰذا کئی متعابات موجود ہیں۔ پس ضعف کا اعتراض مضر نہیں ہے۔

اور جہاں تک قیس بن طلق کے ضعف کا مسئلہ ہے تو ان پر بھی ضعف کا اعتراض غلط ہے؛ کیونکہ وہ مختلف فیہ راوی ہیں؛ بعض نے توثیق اور بعض نے تضعیف کی ہے، حافظ ذہبیؒ، ابن القطانؒ کا قول نقل کرتے ہیں: ''أن یکون خبره حسنًا لا صحیحًا''، معلوم ہوا کہ ان کی روایت کا اعتبار ہے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

الجواب عن استدلال الشافعي:

(۱)۔ حضرت بسرہ کی روایت استحباب پر محمول ہے؛ کیونکہ اگر وجوب پر محمول کیا جائے تو حضرت طلق بن علی کی روایت کا بالکلیہ ترک کرنا لازم آئے گا، حالانکہ وہ سنداً و متناً صحیح ہے اور استحباب پر محمول کرنے سے دونوں پر عمل ہو جاتا ہے۔

(۲)۔ حضرت بسرہ کی روایت غیر واضح اور مبہم ہے، ابہام یہ ہے کہ مس ذکر کیا ہر حالت میں ناقض ہے یا خاص ہے؟ یعنی مس بالشہوۃ ناقض ہے یا مس بلا شہوۃ، اسی طرح مس بالحائل ناقض ہے یا بلا حائل ہی ناقض ہے اور حضرت طلق بن علی کی روایت بالکل ہی واضح ہے، لہٰذا اوضح کو اختیار کیا جائے گا۔

(۳)۔ حضرت بسرہ ہی سے مجمع الزوائد ج:۱، ص:۲۴۵ پر ایک روایت منقول ہے جس میں مس انثیین کو بھی ناقض کہا گیا ہے۔ لہٰذا مس انثیین بھی امام شافعیؒ کے یہاں ناقض ہونا چاہیے، حالانکہ وہ اس کے قائل نہیں، لہٰذا ان کی دوسری روایت سے مسِّ ذکر سے نقضِ وضوء کا حکم لگانا درست نہیں ہوگا؛ کیونکہ سنداً دونوں روایات صحیح ہیں پھر کیا بلاء کہ ایک کو لیا جائے اور ایک کو نظر انداز کر دیا جائے۔

(۴)۔ حضرت طلق بن علی اور حضرت بسرہ بنت صفوان کی روایت کا تعارض ہوا اور دونوں صحیح الاسناد ہیں، لہٰذا رفع تعارض کے لیے تعامل صحابہ کی طرف ہم نے نظر کیا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُجلّ صحابہ اور اکثر صحابہ عدمِ نقض کے قائل ہیں اور اسی پر ان کا عمل ہے، مثلاً: حضرت ابن مسعود، حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم وغیرہ کا تعامل حضرت طلق بن علی کی روایت پر ہے، اس لیے ان ہی کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی۔

(۵)۔ قیاس بھی اسی کا متقاضی ہے کہ مسِّ ذکر سے وضو نہ ٹوٹے؛ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مس انثیین بالذکر اور مس ذکر بالفخذین ہوتا رہتا ہے اور اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، اس

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

کی وضاحت یہ ہے کہ ہاتھ تو ستر نہیں اور فخذ (ران) اور انثیین (خصیتین) ستر میں سے ہیں اور اگر ذکر فخذ سے مس ہو جائے یا انثیین سے اس کا مس ہو جائے تو بالاتفاق وضو نہیں ٹوٹتا حالانکہ وہ ستر ہیں۔ لہٰذا مس ذکر بالید یعنی ہاتھ سے ذکر کا اگر مس ہو جائے تو بھی ناقض نہ ہوگا؛ کیونکہ ستر کے مس سے وضوء نہیں ٹوٹتا تو پھر غیر ستر سے کیوں کر ٹوٹ جائے گا؟

(محل امتحان نمبر:۳۸) الوضوء من قبلة الرجل امرأته

عن مالک عن ابن شهاب عن سالم بن عبد الله عن أبيه عبدالله بن عمر أنه كان يقول: قبلة الرجل إمرأتهٗ وجسُّها بيدهٖ من الملامسة؛ فمن قبّل إمرأتهٗ أو جسَّها بيدهٖ فعليه الوضوء.

تقبیل مرأۃ ناقض وضوء ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ائمہ کا زبردست اختلاف ہے اور یہ اختلاف، مسِ مرأۃ کے ناقض و عدمِ ناقض میں اختلاف ہونے کی وجہ سے ہوا ہے اور مس مرأۃ کا اختلاف آیت "اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ" کی تفسیر میں اختلاف پر مبنی ہے۔

مذاہب:

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تقبیل مرأۃ ناقض نہیں ہے جس طرح مسِ مرأۃ ناقض نہیں ہے یعنی حضرت الامام چونکہ مس مرأۃ کے عدمِ ناقض کے قائل ہیں اس لیے تقبیل مرأۃ بھی ناقض نہ ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ: ناقض وضو ہونے میں متفق ہیں مگر تفصیل میں قدرے اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ:

مسِ مرأۃ مطلقاً ناقضِ وضو ہے یعنی خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ مس بالشہوۃ ہو یا بغیر شہوت کے۔ حتی قال بعض الشافعية: "حتّٰى إذا لطمها أو داوىٰ جرجها

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

انتقض وضوءہ"، یعنی اگر کسی نے کسی عورت کو طمانچہ رسید کیا یا اس کے زخم میں دوا رکھی تو ظاہر ہے اس میں بھی مس ہوگا لہٰذا اس کا وضو جاتا رہے گا، البتہ امام شافعیؒ کے یہاں مس بلا حائل کی قید ہے۔

امام مالکؒ: ان کے یہاں تین شرطوں کے ساتھ ناقض ہے:

(۱) صغیرہ نہ ہو یعنی کبیرہ ہو۔

(۲) اجنبیہ ہو یعنی محرمہ نہ ہو۔

(۳) مس بلا شہوۃ نہ ہو یعنی مس بالشہوۃ ہو۔

امام احمدؒ: امام احمدؒ سے تینوں روایات منقول ہیں:

(۱) شافعیہ کے مطابق مطلقاً ناقض ہے بشرطیکہ مس بلا حائل ہو۔

(۲) مالکیہ کے مطابق یعنی تین شرطیں (جو ان کے یہاں ملحوظ ہیں) ملحوظ ہوں۔

(۳) احناف کے مذہب کے مطابق یعنی مطلقاً غیر ناقض (کما قاله العلامة ابن القدامة) حاصل کلام یہ کہ من جملہ ائمہ ثلاثہ مس مرأۃ کو ناقض مانتے ہیں۔

سببِ اختلاف کی وضاحت:

ماقبل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مس مرأۃ میں اختلاف، آیتِ قرآنی "اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ" کی تفسیر میں اختلاف پر مبنی ہے؛ اس کی وضاحت یہ ہے کہ آیتِ مذکورہ میں "لٰمَسْتُمْ" سے ائمہ ثلاثہ نے "مس بالید" (چھونا) مراد لیا ہے، ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ بعض قرأت میں لَمَسْتُمْ مجرد کے ساتھ آیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہاں لمس بالید ہی مراد ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں یہاں جماع کا بیان ہے یعنی لٰمَسْتُمْ میں لمس سے کنایۃً جماع مراد ہے: وهو مروي عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه وابن عباسؓ وعائشةؓ زوج النبي صلى الله عليه وسلم.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

’’جماع‘‘ مراد ہونے پر قرینہ:

آیت ’’اَوْ لٰمَسْتُمُ‘‘ میں لمس سے جماع مراد ہونے پر قرینہ بھی موجود ہے، وہ یہ ہے کہ لٰمَسْتُمُ بابِ مفاعلۃ سے ہے جس کے اندر اشتراک ہوتا ہے، یعنی لمس میں دونوں (زوجین) شریک ہوں۔ اور ملامسۃ جماع کے وقت، بلکہ وقت انزال ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں لٰمَسْتُمُ میں لمس سے جماع ہی مراد ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ کے استدلال کا جواب:

ائمہ ثلاثہ نے لٰمَسْتُمُ سے لمس بالید مراد لیا ہے اور ابن مسعودؓ کی قرأت جو مجرد آئی ہے یعنی ’’اَوْ لَمَسْتُمُ‘‘ اس سے استدلال کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کی قرأت جو مجرد آئی ہے وہ احناف کے مسلک کے خلاف نہیں؛ کیونکہ اس سے بھی مجازاً جماع ہی مراد ہے، تاکہ احادیث سے تعارض نہ ہو۔ نیز دوسری آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کما في قوله تعالیٰ: ’’مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ‘‘ میں ’’مس‘‘ سے جماع ہی مراد ہے، حالانکہ یہاں بھی بہ صیغۂ مجرد آیا ہے۔ لہٰذا وہاں بھی ’’لمس‘‘ اگرچہ مفاعلۃ سے نہیں ہے پھر بھی جماع ہی مراد ہوگا؛ کیونکہ اگر وہاں جماع مراد نہ لیا جائے تو ’’اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ‘‘ سے پہلے ہے: ’’اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ‘‘ اس میں احکام حدثِ اصغر کا بیان ہے۔ اور اَوْ لٰمَسْتُمُ میں بھی آپ کے بقول اگر حدثِ اصغر کا بیان ہے تو اب سوال یہ ہے کہ حدثِ اکبر کا بیان کہاں ہے؟ معلوم ہوا کہ آیت میں اگر جماع مراد نہ لیا جائے تو آیت کا احکامِ جنابت (حدثِ اکبر) کے بیان سے خالی ہونا اور حدثِ اصغر کے بیان کا تکرار لازم آئے گا، حالانکہ تاسیس، تاکید سے اولیٰ ہے۔ اس لیے جماع ہی مراد ہوگا، تاکہ احکام وضوء اور احکام غسل کا بیان معاً ہو جائے۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

دلائل احناف:

(۱)۔ ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایت: عن عائشة قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يقبل بعض أزواجه ثم يصلي ولا يتوضأ.

(ترمذي: ج:۱، ص:۲۵)

(۲)۔ مسلم شریف کی روایت ہے: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں پایا۔ جب تلاش کرنے لگی تو میرا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے قدم مبارک پہ پڑا؛ ان کے دونوں پاؤں کھڑے تھے وہ مسجد میں تھے الخ۔

(۳)۔ حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے: قالت: رأيتني ورسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي وأنا مضطجعة بينهٔ وبين القبلة فإذا أراد أن يسجد غمز رجليّ فقبضتها. (بخاری شریف: ج:۱، ص:۷۴)

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مس مرأۃ ناقض نہیں ہے۔ لہٰذا آیت أَوْ لَمَسْتُمُ میں بھی لمس بالید نہیں بلکہ جماع مراد ہوگا، ورنہ مس مرأۃ کا ناقض اور جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بغیر طہارت کے نماز پڑھنا لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔

(محل امتحان نمبر: ۳۹) وجوب الغسل إذا التقى الختانان

عن مالك عن ابن شهاب عن سعيد بن المسيب أن عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان وعائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم كانوا يقولون: إذا مس الختانُ الختانَ فقد وجب الغسل.

حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان بن عفان اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا ارشاد ہے کہ التقاءِ ختانین سے غسل واجب ہوجاتا ہے۔

وجوبِ غسل کے لیے انزال ضروری ہے یا صرف مجاوزت مع الاکسال ہی وجوبِ غسل

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

کے لیے کافی ہے؟ عہدِ صحابہ میں اس باب میں اختلاف تھا، بعض حضرات انزال کو شرط قرار دیتے تھے، یعنی اگر صرف مجاوزت ہو تو غسل واجب نہیں ہوگا، بلکہ انزال ضروری ہے۔ بعض حضرات فرماتے تھے کہ صرف مجاوزت مع الاکسال سے غسل واجب ہوجاتا ہے۔ بہت دِنوں تک اختلاف چلتا رہا۔ بالآخر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اس پر اتفاق ہوگیا کہ صرف اکسال سے غسل واجب ہوجائے گا انزال ضروری نہیں ہے۔

دلائل:

زمانۂ اختلاف میں جو حضرات انزال کو شرط ٹھہراتے تھے ان کا استدلال حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے تھا: قال: خرجت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الإثنين إلى قباء. حتى إذا كنا في بني سالم وقف رسول الله صلى الله عليه وسلم على باب عتبان فصرخ به، فخرج يَجُرُّ إزارَهٗ. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أعجلنا الرجل. فقال عتبان: يا رسول الله! أرأيت الرجل يعجل عن إمرأته ولم يُمن، ماذا عليه؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: انما الماء من الماء.

(مسلم شریف: ج:۱، ص:۱۵۵)

(۲)۔ ان کی دوسری دلیل حضرت اُبی بن کعب کی روایت ہے: عن أبي بن كعب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنه قال في الرجل ياتى أهلهٗ ثم لاينزل، قال: يغسل ذكره ويتوضأ. (مسلم شریف: ج:۱، ص:۱۵۵)

پہلی روایت میں آپ ﷺ نے خروجِ ماء یعنی انزال کو وجوبِ ماء یعنی وجوب غسل کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''إنما الماء من الماء''۔

دوسری روایت میں صراحت ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے ملا اور اسے انزال نہ ہوا تو صرف ذکر دھولے اور وضوء کرلے، یعنی اس پر غسل واجب نہیں۔

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

جواب:

حدیث پاک: ''إنما الماء من الماء'' یہ منسوخ ہے؛ کیونکہ حضرت اُبی بن کعب ہی سے مروی ہے: قال: إنما الماء من الماء کان رخصةً في أول الإسلام ثم نهي عنها. معلوم ہوا کہ حدیث مذکور یعنی إنما الماء من الماء منسوخ ہے اور ناسخ دوسری حدیث ہے قال: إذا جاوزا لختان الختانَ فقد وَجَبَ الغُسل.

حضرت رافع بن خدیج سے اس کے منسوخ ہونے کی صراحت ہے (کما في مسند أحمد ومعجم طبراني الأوسط) قال نافع: ثم أمرنا رسول الله صلی الله عليه وسلم بعد ذلک بالغسل. معلوم ہوا کہ پہلے تو حکم وہی تھا یعنی انزال شرط تھا مگر بعد میں وہ حکم منسوخ ہوگیا۔

حضرت عائشہؓ سے بھی إنما الماء من الماء کے منسوخ ہونے کی روایت ہے۔ عن عائشة قالت: إن رسول الله صلی الله عليه وسلم کان يفعل ذلک ولايغتسل وذلک قبل فتح مكة. ثم اغتسل بعد ذلک.

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں، تجاوز ختانان یعنی تواریٔ حشفہ سے بغیر انزال ہوئے بھی وجوبِ غسل پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور بالتفصیل واقعہ پیش کیا ہے: وفيه: فقال عمر عند ذلک: لاأعلم أحداً فعلهٗ إلّا جعلته نكالاً. (شرح معانی الآثار: ج:۱، ص:۴۷)

(محل امتحان نمبر:۴۰) وضوء الجنب إذا أراد أن ينام

عن مالک عن عبد الله بن دينار عن عبدالله بن عمر أنه قال: ذكر عمر بن الخطاب لرسول الله صلی الله عليه وسلم أنه تصيبهُ الجنابةُ من الليل؟ فقال لهٗ رسول الله صلی الله

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

علیه وسلم: توضأ واغسل ذكرك ثم نم. (مؤطا امام مالک: ص:۱۶)
پوری امت کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ جنبی پر سونے سے پہلے غسل واجب نہیں اور وجوبِ وضو میں اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء کرام کا مسلک عدمِ وجوب کا ہے یعنی سب کے سب وضو کے واجب نہ ہونے میں متفق ہیں، البتہ اباحت واستحباب میں اختلاف ہے۔ ائمہ اربعہ استحباب وضو اور امام ابو یوسف، سفیان ثوری، سعید بن المسیب اور حسن بن حی اِباحتِ وضو کے قائل ہیں، داؤد ظاہری اور ابن حبیب مالکی کے نزدیک وضو واجب ہے۔

دلائل:

داؤد ظاہری وغیرہ کا استدلال حدیث باب یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ہے: (۱) عن ابن عمر أنه قال: ذكر عمر بن الخطاب لرسول الله صلى الله عليه وسلم: أنه تصيبهٗ الجنابة من الليل؟ فقال له رسول الله: توضأ واغسل ذكرك ثم نم.

آپ ﷺ نے بہ صیغۂ امر وضو کا حکم فرمایا ہے جس کا تقاضا وجوب کا ہے۔

(۲) ان کی دوسری دلیل ابوداؤد کی روایت ہے: عن عليؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لاتدخل الملائكة بيتًا فيه صورة ولاكلب ولا جنب.

(۳)۔ تیسری دلیل حضرت میمونہ بنت سعد کی روایت ہے: عن ميمونة بنت سعد قالت: قلتُ: يا رسول الله! هل ياكل أحدنا وهو جنب؟ قال: لا، حتّٰى توضأ. قالت: قلت: يا رسول الله! هل يرقد الجنب؟ قال: ماأحب أن يرقد وهو جنب حتى توضأ؛ فإني أخشى ان يتوفى فلايحضره جبرئيل عليه السلام.

جواب:

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ بصیغۂ امر، حکم وضوء سے وجوب ثابت نہیں ہوتا:

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

کیونکہ امر مطلقاً وجوب کے لیے نہیں آتا، بلکہ اگر اِباحت وندب کا قرینہ موجود ہوتو اباحت وندب کے لیے اور قرینہ موجود نہ ہوتو وجوب کے لیے آتا ہے، کما في قوله عز وجل: وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا. یہاں باتفاق مفسرین امر، اِباحت کے لیے ہے، لہٰذا حدیث مذکور میں بھی امر اِباحت کے لیے ہوگا۔

اور قرینہ اس پر یہ ہے کہ اگر امر مندوبی نہ مانا جائے تو دیگر احادیث سے تعارض لازم آئے گا اور اگر امر مندوبی مان لیتے ہیں تو دیگر احادیث سے تعارض لازم نہیں آتا۔ لہٰذا دفعِ تعارض کے لیے امر کو امر مندوبی پر محمول کریں گے۔

دوسری اور تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں جو عدمِ دخولِ ملائکہ بیان کیا گیا ہے وہاں ملائکہ حفظہ مراد نہیں، بلکہ ملائکہ رحمت مراد ہیں، جیسا کہ علامہ خطابی نے تصریح فرمائی ہے کہ انسان سے ملائکہ حفظہ کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتے، لہٰذا ملائکہ رحمت کا عدمِ دخول ثابت ہوا اور ملائکہ رحمت کے عدم دخول سے کسی شئ کا وجوب ثابت نہیں کیا جاسکتا، ہاں زیادہ سے زیادہ استحباب کا ثبوت ہوسکتا ہے۔

دلیلِ اباحت:

امام ابویوسفؒ وغیرہم کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے: عن عائشة قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم ينام وهو جنب ولا يمس ماء.

اس سے معلوم ہوا کہ وضوء کرنا صرف اور صرف مباح ہے اگر مستحب ہوتا تو آپ ﷺ کی شان کے خلاف ہے کہ اس پر عمل نہ کرتے۔

دلیل جمہور:

عن ابن عمر رضي الله عنه أنه سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم: أينام أحدُنا وهو جنبٌ؟ قال: نعم، ويتوضأ إن شاء.

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

آپ ﷺ نے فعلِ وضوء کو مشیتِ عبد پر معلق فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: "ويتوضأ إن شاء" اور مشیتِ عبد پر وجوب کو معلق نہیں کیا جا سکتا، معلوم ہوا کہ وضوء واجب نہیں۔

امام ابو یوسفؒ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ حدیث مذکور میں (جس سے انہوں نے استدلال فرمایا ہے) اس کا بیان نہیں کہ آپ کبھی بھی وضو نہیں فرماتے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ حضرت عائشہؓ وضو نہ کرنے کی خبر دے رہی ہیں اس سے دائماً وضو نہ فرمانے پر استدلال نہیں؛ کیونکہ حضرت عائشہؓ سے ہی دوسری روایت منقول ہے: أنها قالت: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يتوضأ قبل أن ينام. لہٰذا دونوں روایتوں کو جمع کر کے استحباب وضوء کا حکم لگایا جائے گا؛ کیونکہ احیاناً ترک سے استحباب ہی ثابت ہوتا ہے اگر مداومت فرماتے تو وہ مستحب نہیں رہتا؛ بلکہ سنتِ مؤکدہ بن جاتا۔

بحمد اللہ تعالیٰ

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa

Website: NewMadarsa.blogspot.com
Telegram channel : New Madarsa